شذراتِ معرفت

(Nuggets of Divine Knowledge)

تزکیۂ نفس کے فکری و عملی پہلوؤں پر ایک نظر

ابوصالح انیس لقمان ندوی

صدر شعبۂ تحقیق۔ سدرۃ فاؤنڈیشن

www.sedra.org

نام کتاب : شذرات معرفت

مصنف : ابوصالح انیس لقمان ندوی

طباعت : نورانی پریس، آگرہ روڈ، مالیگاؤں

تعداد : 1000

کمپوزنگ اینڈ ٹائٹل : رمضان پینٹر، مالیگاؤں

قیمت : ₹40

ناشر : EBUC®

رابطہ : **RAMZAN PAINTER**
9, Congress Committee Shop. Center,
Nishat Road, Islampura,
Malegaon. 423203 M.S. India.
Cell: 9890127095 - 9970660675

EBUC®
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست

پیش لفظ 4
توبہ: ایک ذہنی انقلاب 6
تاعمر جاری رہنے والا عمل 6
مومن کے لئے ''فراغت'' نہیں 7
''روحانی ایندھن'' 7
مومن کی امتیازی خصوصیت 8
نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا 9
نفسِ امارہ اور نفسِ لوّامہ کی کش مکش 9
نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۱) 11
نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۲) 13
نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۳) 14
توبہ اور جدید علم نفسیات 15
''احساسِ خطا'' ایک شخصیت ساز عمل (۱) 17
''احساس خطا'' ایک شخصیت ساز عمل (۲) 18
''معافی کلچر'' 19
''شکریہ کلچر'' (۱/۲) 21
''شکریہ کلچر'' (۲/۲) 22
سید الاستغفار: ایک انقلابی تصور 24
زندگی: ایک انمول ربانی عطیہ 25
قرآن: انسانیت کے لئے شفاء اور رحمت 27
''استرجاع'': ایک ''زندگی بخش'' کلمہ 28
قرآن کیسے سمجھیں؟ 30
لیلۃ القدر "روحِ اسلام" کا کائناتی مظاہرہ 31
تزکیۂ نفس کیا ہے؟ (۱/۲) 33
تزکیۂ نفس کیا ہے؟ (۲/۲) 33
قرآن: آپ کے حق میں یا آپ کے خلاف! 36
معرفت کی کلید 38
اگر آپ آگے نہیں بڑھ رہے؛ تو آپ پچھڑ رہے ہیں! (۱/۲) 39
اگر آپ آگے نہیں بڑھ رہے؛ تو آپ پچھڑ رہے ہیں! (۲/۲) 40
رمضان کب اور کس کے لئے ''مبارک'' ہے؟ 42
نفع بخش بنئے یا بے ضرر بن کر جینا سیکھئے 44
عید کا گلدستہ 'رمضان' (رمض+ا+ن) 46
ربانیت کا نقطہ آغاز 51
روزہ اور ''وقت شناسی'' (۱/۲) 52
روزہ اور ''وقت شناسی'' (۲/۲) 53
روزہ: برتر اسلامی کردار کی شناخت 54
روزہ: ''حساسیت کے توازن'' کی بحالی کا ذریعہ (۱/۲) 55
روزہ: ''حساسیت کے توازن'' کی بحالی کا ذریعہ (۲/۲) 57
ایمان اور احتساب 58
تلاوت اور تدبرِ قرآن (۱/۲) 59
تلاوت اور تدبرِ قرآن (۲/۲) 60
مقبول روزے کی علامت 62
دعاء کی قیمت 63
روزہ: قرآنی زندگی کی تمہید 64
ربانی صبر 65
تخلیہ اور تحلیہ 66
پیغمبرانہ حکمتِ عملی (۱/۲) 67
پیغمبرانہ حکمتِ عملی (۲/۲) 68
عادت اور عبادت 70
دو مسرتیں 71
روزہ: حیات بعد الموت کی تیاری (۱/۲) 72
روزہ: حیات بعد الموت کی تیاری (۲/۲) 73
دعائے لیلۃ القدر (۱/۳) 75
دعائے لیلۃ القدر (۲/۳) 76
دعائے لیلۃ القدر (۳/۳) 76
روزہ داری: ربانی اوصاف کی آئینہ داری (۱/۲) 78
روزہ داری: ربانی اوصاف کی آئینہ داری (۲/۲) 79
قرآن: انسانیت کی تقدیر 80
تقدیر کیا ہے (۱/۳) 82
تقدیر کیا ہے (۲/۳) 83
تقدیر کیا ہے (۳/۳) 84
ہلالِ عید کا پیغام 85

پیش لفظ

سونے کی کان میں ہزاروں ٹن مٹی کے نیچے اس زرد دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں۔ جب ان خام مگر بیش قیمت معدنی ٹکڑوں کو گرد وغبار سے صاف کر کے یکجا کیا جاتا ہے تو انھیں عربی میں ''شَذَرات'' (واحد شذرہ) کہتے ہیں۔ اردو ادب میں اس لفظ کا اطلاق مجازاً ایسی تحریر پر ہوتا ہے جس کا کوئی ایک متعین موضوع نہ ہو، بلکہ وہ مختلف ادبی وعلمی اور سیاسی وسماجی موضوعات پر سرسری اشاروں یا مختصر فقروں کا مجموعہ ہو۔ برِّصغیر میں غالباً ''معارف''، اعظم گڑھ، پہلا اردو ماہنامہ ہے، جس نے اپنے اداریے کا عنوان اسی بنا پر ''شَذَرات'' رکھا؛ جس کا تقریباً ہر پیراگراف عالمِ فکر وادب وغیرہ کے متنوع احوال وواقعات پر ایک مستقل خبریہ یا انشائیہ مضمون کی حیثیت رکھتا تھا۔

زیرِ نظر رسالہ ایسے ہی مختصر اور متنوع فقراتی مضامین پر مشتمل ہے۔ تاہم اختصار اور تنوع کے باوجود، ان میں ایک موضوعاتی یا مقصدی وحدت پائی جاتی ہے اور وہ ہے: معرفتِ ربانی اور تزکیۂ نفس۔ اسی لئے اسے ''شَذَراتِ معرفت'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے یہ ''شَذَراتِ معرفت'' رمضان المبارک 2016 اور 2017 کے دوران ''رمضان ڈائری'' کے نام سے اپنے وہاٹس آپ (WhatsApp) گروپ کے لئے یومیات (روزنامچے) کی شکل میں لکھے تھے۔ اس لئے ہر ''شذرہ'' کے شروع میں دن اور تاریخ کا اندراج کیا گیا ہے۔ موجودہ رسالہ میں ان کو جمع کرتے وقت چند مقامات پر صرف جزوی ترمیم یا اغلاطِ طباعت کی تصحیح کی گئی ہے اور کہیں کہیں مزید وضاحت کی غرض سے عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ البتہ اصل مضامین میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، تاکہ ان کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

ربانی فکر وکردار کی تشکیل کے چار بنیادی عناصر ہیں: خود شناسی، خدا شناسی، وقت شناسی اور آخرت شناسی۔ ان ''شَذَراتِ معرفت'' میں انہیں عناصرِ اربعہ کے مختلف فکری اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے، تزکیۂ نفس کا سنجیدہ ذوق وشوق رکھنے والے افراد کے لئے ان کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ابوصالح انیس لقمان

۱۵/ جولائی، ۲۰۱۷

رمضان ڈائری 2016

بروز پیر، ۶ رجون، یکم رمضان ۲۰۱۶ء

توبہ: ایک ذہنی انقلاب

رمضان المبارک کو ایک حدیث میں "شہر التوبہ" یعنی توبہ کا مہینہ کہا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ سچی توبہ کے بغیر کوئی بھی شخص رمضان اور قرآن کی ہدایات اور برکات سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ تاہم توبہ سے مراد کچھ الفاظ کی زبانی تکرار نہیں، بلکہ توبہ ایک ذہنی انقلاب اور عملی رویہ میں ٹھوس تبدیلی کا نام ہے جس کی تشریح میں نے گزشتہ سال کی بعض نشستوں میں کی تھی۔ اسی کی یاددہانی کے لئے ایک نشست کی ویڈیو ریکارڈنگ یہاں منسلک کی جاتی ہے۔ * اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان بندوں میں شامل ہونے کی توفیق دے جن کو قرآن میں ''بہت زیادہ توبہ کرنے والے اور مسلسل اپنے آپ کو پاک کرنے والے'' کے الفاظ سے موصوف کیا گیا ہے: "إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" (سورہ البقرہ - آیت، ۲۲۲)

* توبہ کے موضوع پر راقم الحروف کا ایک مفصل بیان (۲۰۱۵) مندرجہ ذیل لنک میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے: https://youtu.be/XNkXKTi5JCk

بروز منگل، ۷ رجون، ۲ ررمضان ۲۰۱۶ء

تاعمر جاری رہنے والا عمل

توبہ واستغفار، محض چند مخصوص الفاظ کو سینکڑوں اور ہزاروں اور لاکھوں یا کروروں بار زبان سے دہرانے کا نام نہیں، بلکہ وہ ربانی معیار کے مطابق، انسانی فکر و کردار کی تطہیر اور تعمیر کا ایک نہایت سنجیدہ عمل ہے، جو ساری زندگی ایک مومن کے اندر گہرے شعور و ادراک کی سطح پر؛ ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی شخص عبدیت اور عبودیت کے اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جہاں رب العالمین بذات خود اپنے سچے بندوں کو یہ ابدی مژدہ سنائے گا کہ: "اے اطمینان پانے والے نفس، اپنے مالک کی طرف لوٹ چل، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے۔ لہذا اب تو شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں" (يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي

رمضان ڈائری 2016

بروز پیر، ۶ رجون، یکم رمضان ۲۰۱۶ء

توبہ: ایک ذہنی انقلاب

رمضان المبارک کوایک حدیث میں "شہرالتوبہ" یعنی توبہ کا مہینہ کہا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ سچی توبہ کے بغیر کوئی بھی شخص رمضان اور قرآن کی ہدایات اور برکات سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ تاہم توبہ سے مراد کچھ الفاظ کی زبانی تکرار نہیں، بلکہ توبہ ایک ذہنی انقلاب اور عملی رویہ میں ٹھوس تبدیلی کا نام ہے جس کی تشریح میں نے گزشتہ سال کی بعض نشستوں میں کی تھی۔ اسی کی یاددہانی کے لئے ایک نشست کی ویڈیو ریکارڈنگ یہاں منسلک کی جاتی ہے۔ ✶ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان بندوں میں شامل ہونے کی توفیق دے جن کو قرآن میں ''بہت زیادہ توبہ کرنے والے اور مسلسل اپنے آپ کو پاک کرنے والے'' کے الفاظ سے موصوف کیا گیا ہے: "إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" (سورہ البقرہ- آیت، ۲۲۲)

✶ توبہ کے موضوع پر راقم الحروف کا ایک مفصل بیان (۲۰۱۵) مندرجہ ذیل لنک میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے: https://youtu.be/XNkXKTi5JCk

بروز منگل، ۷ رجون، ۲ ر رمضان ۲۰۱۶ء

تاعمر جاری رہنے والا عمل

توبہ واستغفار، محض چند مخصوص الفاظ کو سینکڑوں اور ہزاروں اور لاکھوں یا کروروں بار زبان سے دہرانے کا نام نہیں، بلکہ وہ ربانی معیار کے مطابق، انسانی فکر و کردار کی تطہیر اور تعمیر کا ایک نہایت سنجیدہ عمل ہے، جو ساری زندگی ایک مومن کے اندر گہرے شعور و ادراک کی سطح پر؛ ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی شخص عبدیت اور عبودیت کے اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، جہاں رب العالمین بذات خود اپنے سچے بندوں کو یہ ابدی مژدہ سنائے گا کہ: " اے اطمینان پانے والے نفس، اپنے مالک کی طرف لوٹ چل، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے۔ لہذا اب تو شامل ہوجا میرے بندوں میں اور داخل ہوجا میری جنت میں" (يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي

إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (سورۃ الفجر 27-30)

بروز بدھ، ۸/جون، ۳/رمضان ۲۰۱۶ء

مومن کے لئے ''فراغت'' نہیں

توبہ واستغفار کی ضرورت جتنی ایک ''خطا کار اور گنہگار'' کو ہے؛ اسی قدر ایک ''متقی اور پرہیز گار'' کو بھی ہے۔ اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے، توبہ واستغفار درحقیقت بے لاگ خود احتسابی کا عمل ہے، یعنی اپنی نیت اور اپنے قول اور فعل کا مسلسل تنقیدی جائزہ لے کر یہ دیکھنا کہ وہ درست ہے یا نادرست؛ وہ اعلی ربانی معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ نادرست ہے تو گناہ ہے اور اس پر اصرار ظلمِ عظیم، اس لئے اس سے فوری طور پر مخلصانہ توبہ اور استغفار کرنا ایمان اور اسلام کا اولین تقاضہ ہے۔

تاہم اگر اپنا قول یا فعل یا نیت بظاہر درست معلوم ہو، تو اسے اعلی ربانی معیار کے مطابق بنانے کی سنجیدہ تگ و دو کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا؛ ایک مستقل اور نہایت پُرمشقت کام ہے؛ جس سے ایک صاحبِ معرفت مومن عمر بھر ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ نہیں ہوتا۔ حتی کہ ربانی معیار کی عظمت کا شعور اور اس کے ساتھ ہم آہنگی کی تڑپ اکثر اس کو اتنا حساس بنا دیتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں فرصت یا فراغت یا خود پسندی کے محض ایک وقتی احساس کو بھی خدا کی تحقیر یا قدر ناشناسی کے ہم معنی ''گناہ'' تصور کرتا ہے اور بے اختیار وہ توبہ واستغفار میں سرگرم ہوجاتا ہے۔

بروز جمعرات، ۹/جون، ۴/رمضان ۲۰۱۶ء

روحانی ایندھن

روحانی تزکیہ اور اخلاقی ارتقاء کا واحد یقینی ذریعہ، مسلسل توبہ واستغفار کا شعوری عمل ہے۔ اس کے زیر اثر سچے مومن کا ضمیر ایک طرف، انتہائی حساس ہوجاتا ہے جو اسے اپنی ہر چھوٹی یا بڑی غلطی پر شدت سے ٹوکتا اور ملامت کرتا رہتا ہے تاکہ وہ اس کی تلافی کے لئے ہمہ وقت فکرمند اور متحرک رہے۔ جبکہ دوسری طرف، اس کا ذہن کمال پسندی کے اس اعلی ترین ربانی معیار سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے، جو جنت کی کامل اور لازوال دنیا سے کم تر یا اس کے سوا کسی بھی دوسری شئے پر اسے

قانع ہونے نہیں دیتا۔ یہ ذہنی رجحان عملاً اسے اپنی ہر خوبی میں خامی کا متلاشی اور اپنے ہر خوب کو مسلسل خوب تر دیکھنے کا آخری حد تک حریص بنا دیتا ہے۔ اس طرح توبہ واستغفار کا عمل ایک سچے مومن کی زندگی میں کبھی جمود یا ٹھہراؤ آنے نہیں دیتا۔ بلکہ وہ ایک ایسے ''روحانی ایندھن'' کا کام کرتا ہے جو بیک وقت اسے ربانی بصیرت کی روشنی بھی عطا کرے جس میں وہ کھرا اور کھوٹا اور صحیح اور غلط کو پہچان لے؛ نیز اسی کے ساتھ ایک ایسی خودکار قوت محرکہ بھی فراہم کرے جو اسے خدا کی رضا اور جنت تک پہنچانے والی صراط مستقیم پر تاعمر رواں دواں رکھے۔

بروز جمعہ، ۱۰/جون، ۵/رمضان ۲۰۱۶ء

مومن کی امتیازی خصوصیت

۱-''اپنا حساب خود لے لو؛ قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے؛ اور اپنے عمل کو خود تول لو؛ قبل اس کے کہ اس کو تمہارے لئے تولا جائے''۔

۲-''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو مجھے میری خامیوں کا تحفہ دے'' (یعنی میری کمزوریوں سے مجھے خبردار کرے تاکہ میں اس کو دور کرکے خود کو مزید بہتر بنا سکوں)۔

ایک سچے مومن کی شخصیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ اس کی بہترین ترجمانی حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا حکیمانہ اقوال میں موجود ہے۔ وہ ہے: مسلسل اپنا محاسبہ کرنا، اپنے ہر عمل کا، خواہ بظاہر وہ اچھا دکھائی دے، بے لاگ تنقیدی جائزہ لیتے رہنا تاکہ آپ خودفریبی اور خود پسندی کی مہلک بیماری سے محفوظ رہ سکیں اور اس سلسلہ میں اپنے کمالات اور خوبیوں سے زیادہ اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو ٹٹولنا تاکہ آپ دنیا وآخرت میں گرفت ہونے سے پہلے ان کا ہر ممکن تدارک اور ازالہ کرسکیں۔

ایسی زندہ ضمیر اور ربانی معیارِ کمال کی جستجو میں سرگرمِ عمل ایمانی شخصیت، کسی روایتی درسگاہ یا خانقاہ میں پیدا نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ گہرے شعور وادراک کی سطح پر ہمہ وقت دہکنے والی توبہ واستغفار کی بھٹی میں تمام عمر مسلسل تپ کر بنتی ہے۔

بروز سنیچر، ۱۱ر جون، ۶ر رمضان ۲۰۱۶ء

نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا

ترمذی کی ایک روایت کے مطابق عقبہ بن عامرؓ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کہ: "نجات کیا ہے؟"، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو، اپنے گھر میں رہو، اور اپنی خطاؤں پر رویا کرو" (عن عقبة بن عامر رضی الله عنه قال: قلت يا رسول الله ما النجاة؟، قال صلى الله عليه وسلم [أمسك عليكَ لسانكَ وليَسعْكَ بَيتُك وابكِ على خطيئتكَ]. رواه الترمذي)

یہ حدیث موجودہ دنیا میں امن وآشتی اور آخرت میں ابدی نجات اور سلامتی پانے کا مختصر مگر مفید ترین فارمولا پیش کرتی ہے؛ جو شاید ماضی سے زیادہ آج کے پُرفتن دور کے انسانوں کے لئے مشعل راہ بلکہ ایک نسخہ کیمیاء کی حیثیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے مفہوم کو گہرائی سے سمجھا جائے اور پھر اس پر سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

بروز اتوار، ۱۲ر جون، ۷ر رمضان ۲۰۱۶ء

نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ کی کش مکش

مسند احمد اور البیہقی کی ایک روایت کے مطابق، رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ"، یعنی "ندامت ہی توبہ ہے"

گناہ یا غلطی پر ندامت اور شرمندگی کا احساس، دراصل انسانی فطرت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں نفسِ لوامہ ہے جو انسان کی صلاح وفلاح کا واحد سب سے طاقتور وسیلہ ہے۔ اگر وہ زندہ اور بیدار ہو تو کسی گناہ یا غلطی کے سرزد ہوتے ہی وہ اندر سے انسان کو سخت ملامت کرتا ہے؛ جو شدید ندامت اور شرمندگی کی شکل میں اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اسے ہر طرف اپنی ذلت اور ہلاکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ عاجزانہ خدا سے مسلسل توبہ و استغفار کرنے لگتا ہے، نیز اس کے لازمی تقاضہ کے طور پر وہ ایک طرف اپنی غلطی یا گناہ کے منفی اثرات

کو حسنِ عمل سے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے اندر دوبارہ اسے کبھی نہ کرنے کا سچا عزم ابھرتا ہے۔

مگر شاید انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اپنی انانیت اور خود پسندی (قرآنی اصطلاح میں نفس امارہ) کے تحت اکثر وہ ندامت اور شرمندگی کے اس فطری احساس کو دباتا یا چھپاتا ہے بلکہ اپنے ظاہری وقار کے تحفظ کی خاطر یا سطحی خاندانی رجحانات کی رو میں بہہ کر یا مروجہ سماجی اور ثقافتی روایات کے زیر اثر؛ وہ کسی غلطی کے اقرار یا گناہ پر اظہارِ ندامت کو اپنی "شان کے خلاف" ایک معیوب فعل یا بزدلی سمجھ لیتا ہے، اس لئے نفسِ لوامہ کے بالکل برعکس، اس کا نفس امارہ اسے اپنی ہر غلطی اور گناہ کا خوبصورت جواز تلاش کرنے اور بسا اوقات اس کو ناگزیر بتانے حتی کہ اسے ایک قسم کی 'نیکی' ثابت کرنے میں سرگرم کر دیتا ہے۔ اس طرح جو گناہ بروقت سنجیدہ ندامت کے ذریعہ 'توبہء نصوح' بن کر اس کے ڈگمگاتے قدموں کو خدا کی صراطِ مستقیم پر جما دیتا، وہ "گناہ پر دانستہ اصرار" کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان بتدریج صراطِ مستقیم سے بھٹک کر خدا کے غضب کی راہ پر چل پڑتا ہے، پھر شیطان ایسے شخص کو اپنے جھوٹے بھرم اور خود فریبی کے جال سے نکلنے نہیں دیتا بلکہ اپنی وسوسہ اندازیوں کے ذریعہ گناہوں کے بارے میں اس کی بے حسی اور ڈھٹائی کو بڑھاتا رہتا ہے تاکہ وہ کبھی آدم کی طرح سچی توبہ واستغفار کی توفیق نہ پا سکے۔ غالب کا یہ شعر اسی "شیطانی مزاج" سے مغلوب انسان کی تصویر کشی کرتا ہے۔

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یاد رکھیئے، خدا کی داد و بخشش، کردہ یا نا کردہ گناہوں کی حسرت پر نہیں؛ بلکہ سچی ندامت پر ملتی ہے۔ اسی سچی ندامت کے احساس کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کے لئے ایک اور حدیث میں اہل ایمان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ: "اپنے گناہوں پر رویا کرو"۔

نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۱)

ترمذی کی ایک روایت کے مطابق عقبہ بن عامرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ: ''نجات کیا ہے؟''، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو، اپنے گھر میں رہو، اور اپنی خطاؤوں پر رویا کرو''۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مذکورہ حدیث موجودہ دنیا میں امن وآشتی اور آخرت میں ابدی نجات اور سلامتی کا ایک نہایت سادہ عملی فارمولا پیش کرتی ہے؛ جو ایک با مقصد انسان کے لئے ہر زمانے میں، بالخصوص آج کے پُرفتن دور میں نسخہء کیمیاء ہے۔ اس فارمولے کے تینوں نکات گویا سنگ میل ہیں، جو ایک سچے تائب اور جنت کے طالب کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتے اور ان کی مدد سے وہ اپنے ماحول کے پُرکشش تماشوں سے بچتے ہوئے اپنی اخروی منزلِ مقصود کی سمت یکسوئی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ یہاں اس کے ہر نکتے کی مختصر تشریح کی جاتی ہے:

۱-''اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو'':- اس کا مطلب سادہ طور پر صرف چپ رہنا نہیں، بلکہ زبان یا الفاظ کا ''ذمہ دارانہ'' استعمال ہے۔ ''زبان''، انسان کی سوچ، اس کی نیت اور ارادہ، اور اس کے تخیلات، جذبات اور احساسات کی ترجمان بھی ہے اور بیک وقت ان کو خوبصورت اور پُرفریب اور گمراہ کن الفاظ کے پردے میں چھپانے کا ذریعہ بھی۔ اس کا ذمہ دارانہ استعمال، جہاں فرد اور سماج اور وسیع تر انسانیت کے لئے فائدہ مند ہے؛ وہیں اس کا غیر ذمہ دارانہ استعمال ہر ایک کے لئے بے پناہ حد تک نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ اسی لئے قرآن وحدیث کی رو سے قول اور فعل دونوں کو خدا کی میزان میں یکساں طور ہر قابلِ ثواب یا قابلِ عذاب بتایا گیا ہے۔ توحید اور شرک، محبت اور نفرت، تجارت اور سیاست، دوستی و دشمنی جیسے شخصی تعلقات، نکاح وطلاق جیسے خاندانی روابط، اور امن و جنگ، جیسے قومی اور بین اقوامی معاملات وغیرہ وغیرہ؛ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کے اندرونی ارادہ و اذعان کا پہلا اظہار زبان (قول) سے ہوتا ہے اور پھر وہ اس کی نیت اور خارجی حقیقت کے ساتھ مطابقت یا عدم مطابقت کے

تناسب سے، اچھے اور برے فعل، یا مفید اور مضر سرگرمی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ہر نیکی یا بدی کا بیج، پہلے فکر اور خیال اور سوچ اور نیت اور آرزو بن کر انسانی ذہن میں پنپتا ہے پھر انسان اسے اپنے قول اور فعل کے ذریعہ پروان چڑھاتا ہے۔ لہذا انسان اگر ''زبان'' اور ''الفاظ'' کے بارے میں اپنی جوابدہی اور ذمہ داری کا حقیقی احساس کر لے تو وہ حد درجہ محتاط ہو جائے۔ خصوصاً آج کے دور میں جبکہ جدید ذرائع ابلاغ نے ''زبان'' کے منفی یا مثبت دائرہء اثر کو انتہائی غیر محدود اور ناقابلِ انضباط بنا دیا ہے۔ مثلاً کسی ملی یا قومی معاملہ میں ایک غلط رائے یا فتویٰ محض ایک فرد یا چند افراد کو نہیں بلکہ لاکھوں اور کروروں انسانوں کی گمراہی اور ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے، جس کا تدارک کرنا شاید کئی صدیوں اور نسلوں میں بھی ممکن نہیں۔

''اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو''۔۔۔ اس نکتہ کا سب سے زیادہ پُرحکمت اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ نفسیاتی اور عملی دونوں اعتبار سے انسان صرف ''زبان'' اور ''قول'' پر ہی کنٹرول کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے قول کے محرکات (فکر وخیال، نیت اور جذبات وغیرہ) پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا نہ ہی زبان سے نکلے ہوئے اقوال پر مترتب ہونے والے افعال اور ان کے نتائج اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اسلام نے ''زبان'' کے صحیح یا غلط استعمال اور بالآخر اس کے متعلقہ اچھے یا برے اثرات کے لئے ہر انسان کو مکمل طور پر جوابدہ اور ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس کو اپنے قابو میں رکھنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ الاحزاب کی آیت نمبر 70 میں اہل ایمان کو ''قول سدید'' کا حکم دیا گیا ہے، یعنی زبان سے صرف ایسی بات کہنا جو آپ کی نیت اور ارادہ کا سنجیدہ بیان ہو اور جو اس کے مطابق جلد یا بدیر خارجی دنیا میں حقیقی عمل یا مثبت واقعہ بن سکے جس پر بالآخر آپ کو اجر ملے گا۔ دوسری طرف سورہ الصّف کی آیت (2-3) میں ''زبان'' کے غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ استعمال پر سخت تنبیہ کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو کہا گیا ہے کہ: ''ایسی بات کیوں کہتے ہو جسے کرتے نہیں، یہ خدا کی نظر میں بہت زیادہ ناگوار امر ہے کہ تم وہ بات کہو جس کو کرتے نہیں''۔

نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۲)

۲-''اپنے گھر میں رہو''۔۔۔یہاں ''گھر'' سے مراد بنیادی طور پر وہی جگہ ہے جہاں آدمی تنہا یا اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رہتا ہے۔ البتہ اس کے توسیعی مفہوم میں عام رہائش گاہ کے ساتھ آدمی کا دائرہ ء اختیار ونفوذ (Range of Capacity & Infulence) بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہاں ''اپنے گھر میں رہو'' کے الفاظ سے روزمرہ زندگی میں اسی حکمت عملی کو اپنانے کی تلقین مقصود ہے جو حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اس طرح کی تھی کہ ''اپنے گھروں کو قبلہ بنالو'' (سورہ یونس، آیت 87) یعنی اپنی توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز، خدا پرست، بامقصد اور آخرت پسند گھرانے اور خاندان کی تعمیر کو بناؤ۔ صالح افراد کے ذریعہ صالح خانوادے اور صالح خانوادوں کے ذریعہ صالح معاشرہ اور صالح قوم۔ یہ ہے انسانی اصلاح اور تعمیر وترقی کا پیغمبرانہ فریم ورک۔

زمانی فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو اپنی توجہ، توانائی اور سرگرمی کا مرکز ومحور اپنے ''گھر'' اور توسیعی معنی میں اپنے ''دائرہ ءاختیار ونفوذ'' کو بنانا، بیک وقت انتہائی دانشمندی اور اعلیٰ درجہ کی شائستگی کی علامت ہے۔ جو مرد یا عورت اپنے گھر اور دائرہ ءاختیار ونفوذ سے باہر کے معاملہ میں جتنی زیادہ دلچسپی لے گا اتنا ہی وہ اپنے گھر اور دائرہ ءاختیار ونفوذ کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ پورا کرنے میں کوتاہ یا ناکام ثابت ہوگا اور اس سے بڑی نادانی کی بات اور کوئی نہیں۔ کیونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسا شخص اکثر حقیقت کی دنیا میں عملاً اپنے ''گھر'' کے ''اندر'' اور ''باہر''، دونوں ہی جگہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ اپنے ''خارج استطاعت'' دائرہ میں داخل ہوتے ہی آدمی اپنے ''داخلِ استطاعت'' دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے اور بالآخر دونوں جگہ اس کا اثر ونفوذ کم یا بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

مزید یہ کہ مختلف تاریخی وتمدنی اسباب کے نتیجہ میں موجودہ دور آخری حد تک انفرادیت پسندی اور دوسروں کے معاملات میں ''عدم مداخلت'' کا زمانہ ہے۔ اس طرح ''اپنے گھر میں رہو'' کا اصول زمانی شائستگی کے برتر معیار سے ہم آہنگ بھی ہے۔ تیز رفتار مواصلات اور فوری کمیونیکیشن کے

ترقی یافتہ وسائل نے ساری دنیا کو سمیٹ کر نہ صرف ایک ''گلوبل ویلیج''، بنا دیا ہے، بلکہ تقریباً ہر گھر کو ایک ''گلوبل ہاؤس'' میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ ایک بامقصد اور خدا شناس انسان کے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ حکمتِ عملی کے مطابق اپنے ''گھر'' اور ''دائرہ ءاختیار ونفوذ'' میں رہتے ہوئے بھی اپنے وسیع تر خاندان، معاشرہ اور انسانی برادری کے ساتھ خوش گوار تعلقات استوار رکھے، ان کی حتی الامکان خبر گیری اور حسب استطاعت دستگیری کرے اور رفاہ عام اور اصلاح و دعوت کے کام میں اپنا مؤثر کردار بھی ادا کر سکے۔

بروز بدھ، ۱۵؍جون، ۱۰؍رمضان ۲۰۱۶ء

نجات کا سہ نکاتی نبوی فارمولا (۳)

۳-''اپنی خطاؤوں پر رویا کرو''۔ اس نکتہ کی تشریح مسند احمد کی روایت ''الندم توبہ'' یعنی ندامت ہی توبہ ہے کے ذیل میں ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو، رمضان ڈائری، بروز اتوار، ۱۲ جون، ۲۰۱۶)۔ تاہم یہاں مزید چند لطیف پہلوؤں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

''خطاؤوں پر رونا'' دراصل شرمندگی اور ندامت کا سنجیدہ احساس کرنے کا نام ہے جو اکثر آنکھوں سے آنسو بن کر بے اختیار چھلک پڑتا ہے۔ تاہم اصل مطلوب سچا احساس ندامت ہے، خواہ اس پر کبھی رونا آئے یا نہ آئے۔ یہ احساسِ ندامت کوئی سلبی (Passive) عمل نہیں، بلکہ اپنے ضمیر یا نفس لوامہ کو زندہ اور بیدار رکھنے کا واحد مؤثر ترین وسیلہ ہے جس کے براہ راست مثبت نتیجہ کے طور پر ایک خدا شناس آدمی کے اندر یہ صحت مند جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے حسن عمل اور نیکیوں میں مسلسل کمیاتی اور نوعیاتی اضافہ کا حریص بن کر اپنی خطاؤوں کی تلافی کرتا رہے نیز اپنے آپ کو وہ قساوتِ قلب، غفلت اور اخلاقی بے حسی کے مہلک روگ سے محفوظ رکھے تاکہ آئندہ اس قسم کی دوسری خطائیں اس سے سرزد نہ ہوں۔

اپنی خطاؤوں پر رونا بمعنی نادم اور تائب ہو کر اس کی تلافی کیے لئے مثبت عمل میں ہمیشہ سرگرم رہنا، ''آدمیت'' ہے، جبکہ اس کے برعکس ''ابلیسی یا شیطانی'' ماڈل ہے: اپنی خطاؤوں اور

خامیوں کا خوبصورت جواز تلاش کرنا؛ اپنی سوچ اور عملی روش پر کبھی نظر ثانی نہ کرنا بلکہ مختلف دینی و دنیوی تنبیہات کے باوجود انھیں بدلنے کی سنجیدہ کوشش کے بجائے خودساختہ بہانوں اور جھوٹے عذر کی بنیاد پر اپنے آپ کو معصوم اور مظلوم ثابت کرنا۔

قرآن میں آدم اور ابلیس کا قصہ انھیں دو متضاد کرداروں کو واضح کرنے کے لئے بار بار بیان ہوا ہے تاکہ ہر انسان خدا کی اسکیم اور اس کی نظر میں مقبول (آدمی) اور غیر مقبول (ابلیسی) کردار سے اچھی طرح باخبر ہوجائے اور اس زندگی میں اپنی آزادی سے جس کردار کو چاہے اپنائے تاکہ اسی کے مطابق اسے آخرت کی دنیا میں جنت یا جہنم کا مستحق قرار دیا جائے۔ جنت اس کے لئے ہے جو آدم کی طرح بلا بحث اپنی خطا کی پوری ذمہ داری قبول کرے، اس پر شرمندہ اور نادم ہوکر خدا سے سچی توبہ کرے اور نیک عملی کو اپنا نصب العین بنائے۔ جبکہ جہنم اس کے لئے ہے جو ابلیس کی طرح اپنی خطا کو اپنا کمال یا دوسروں کا ظلم بتائے اور پھر خطا در خطا کا مرتکب ہوتا چلا جائے۔

بروز جمعرات، ۱۶؍جون، ۱۱؍رمضان ۲۰۱۶ء

توبہ اور جدید علم نفسیات

توبہ اور اس پر مبنی ذہنی تصورات اور عملی سرگرمیوں (جیسے گناہ پر ندامت و شرمندگی، خدا کی پکڑ کا ڈر، آخرت کا ابدی عذاب اور اس سے بچنے کے لئے کفارہ وغیرہ) کو جدید علم نفسیات میں خلشِ گناہ (Guilt) کا نام دے کر سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، حتی کے سگمنڈ فرائڈ اور اس کے نظریۂ لاشعور پر مبنی وسیع و عریض لٹریچر میں، ضمیر یا خدا یا والدین یا کسی اور برتر مذہبی یا اخلاقی اتھارٹی کے خوف کو اکثر دماغی بیماریوں (Mental Disorders)، نفسیاتی الجھنوں (Psychic Complexes)، متعدد جسمانی عوارض اور مجرمانہ رجحانات (Criminal Tendencies) کا اصل سبب بتایا گیا ہے۔ کارل مارکس نے اگر مذہب کو ''افیون'' کہہ کر اس کا مذاق اڑایا تھا تو فرائڈ اور اس کے ہمنوا جدید ماہرینِ نفسیات نے مذہبی عقائد و اعمال کو ایک قسم کا ''جنون'' ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کم و بیش موجودہ زمانے کا ہر تعلیمی، سماجی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی ادارہ ان نظریات سے متاثر ہے اور

ان کے تصوراتی ڈھانچہ اور عملی نظام پر ان کی براہ راست یا بالواسطہ گرفت ہے۔ ناول، ڈرامے، فلم انڈسٹری اور فنون لطیفہ کے تمام شعبوں پر ان کی چھاپ شاید سب سے زیادہ گہری اور ہمہ گیر ہے۔

یہاں ان کے تفصیلی تجزیہ یا تنقید کا موقع نہیں۔ مگر مختصراً یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخ، علم الانسان اور انسانی نفسیات کا گہرا علمی مطالعہ برعکس طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ مذہب انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، جس کی صحیح تسکین کے بغیر انسان کو حقیقی معنوں میں صحت مندی اور سعادت مندی کا تجربہ نہیں ہوسکتا۔

جو چیز انسان کی نفسیاتی اور جسمانی صحت کے لئے نقصان دہ اور تباہ کن ہے وہ فی نفسہ ''مذہب'' نہیں، بلکہ مذہب کی غیر مستند شکلیں ہیں جو غیر مشتبہ وحی و الہام کے بجائے انسانی توہمات، دیومالائی قصوں اور خودساختہ فلسفوں کی بنیاد پر قائم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گناہ پر ''ندامت اور شرمندگی'' کا سچا احساس کسی بھی درجہ میں انسان کے لئے مضر نہیں، بلکہ اصل مضرت انگیز چیز ہے اس احساس کو دبانے یا اس سے بچنے کی کوشش میں خود گناہ کے گناہ ہونے کا انکار کرنا، یا اس کو جواز کا رنگ دینا، یا اس کی ذمہ داری اپنے سوا کسی اور (ماحول، والدین، خاندانی و سماجی روایات، دوست یا دشمن، ظالم دنیا کے ناسازگار حالات، قسمت کی خرابی اور خدا کی نامہربانی وغیرہ) کے اوپر ڈالنا ہے۔ کائنات میں اس مہلک رجحان کا بانی ابلیس ہے، جدید نفسیات کے بعض مذہب بیزار عناصر نے اسے محض سائنسی توجیہات کا پرفریب لبادہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔

''خلشِ گناہ یا گلٹ'' اگر حقیقی خوفِ خدا اور آخرت کی جوابدہی کے احساس کا نتیجہ ہو تو وہ جتنا شدید اور گہرا ہوگا، اتنا ہی انسان کی صلاح اور فلاح و سعادت کے لئے اکسیر کا کام کرتا ہے۔ پہلے انسان (آدم علیہ السلام) سے لے کر تاریخ کے ہر دور میں انبیاء و رسل اور دیگر صالحین، بلا استثناء عام لوگوں سے زیادہ ''احساسِ خطا'' اور ''خوفِ خدا'' میں جینے والے افراد تھے اور اس کے باوجود بلکہ اسی بنا پر ان کی شخصیت تمام نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک (Complex-Free)، ہر پہلو سے متوازن (Balanced) اور زندگی کے مختلف مسائل اور چیلینجوں سے نہایت حکیمانہ انداز میں نمٹنے کی

صلاحیت رکھتی تھی نیز اکثر ظاہری شان وشوکت کے اسباب سے محرومی اور سخت مخالفت اور دشمنی کے ہجوم میں بھی وہ اپنے ذہنی سکون اور خود اعتمادی کو بحال رکھتے ہوئے اپنے اصولوں اور ترجیحات کے مطابق اپنے مقصدِ حیات کے لئے یکسو رہے۔اس قسم کی متوازن، یکجہت اور ہر طرح کے حوصلہ شکن اور نامساعد حالات کے سایہ میں اپنے مذہبی عقیدہ اور مقصدِ اعلیٰ کے لئے تاعمر پوری دلجمعی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنے والی شخصیتیں، اس حقیقت کا تاریخی ثبوت ہیں کہ سچا مذہب دراصل انسان کی ہمہ جہتی صحت و سلامتی اور کامیابی وسعادت کا واحد سرچشمہ ہے اور اس سے انحراف، ہر قسم کی الجھنوں، پریشانیوں اور روحانی واخلاقی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب۔

بروز جمعہ، ۱۷ر جون، ۱۲ر رمضان ۲۰۱۶ء

''احساسِ خطا'' ایک شخصیت ساز عامل (۱)

جدید نفسیات کا یہ انتہائی پُرفریب نظریہ ہے جو ساری دنیا کے ذہین طبقوں پر چھایا ہوا ہے، کہ احساسِ خطا یا ''خلشِ گناہ'' (Guilt) انسان کی عقلی وجسمانی صحت اور اس کی شخصیت کی متوازن نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔اس مفروضہ کی بنا پر، مذہبی عقائد یا اخلاقی قدروں کے حوالے سے کسی گناہ یا غلطی پر ملامت کرنا یا خدائی عذاب سے ڈرنا اور ڈرانا یا ندامت وشرمندگی وغیرہ کا اظہار کرنا، نام نہاد ماہرین کے بقول، مختلف قسم کے ذہنی اضطراب اور نفسیاتی الجھنیں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے جو بالآخر اخلاقی انحراف سے لے کر جسمانی امراض اور بعض مجرمانہ افعال تک کے ارتکاب کا سبب یا محرک بن جاتی ہیں۔

مگر اس سلسلہ میں میری تحقیق اور غور وفکر کا حاصل یہ ہے کہ درحقیقت جو چیز انسان کے عقلی نشوونما اور اخلاقی ارتقاء کی قاتل ہے وہ خود ''احساسِ خطا'' یا ''خلشِ گناہ'' نہیں؛ بلکہ اس سے بچنے یا اس پر پردہ ڈالنے کی مصنوعی کوشش ہے جو اپنے خود ساختہ بھرم یا ''وقار'' یا وقتی مفاد کو بچانے کے لئے اکثر وبیشتر لوگ کرتے ہیں۔

احساسِ خطا فی نفسہ ایک فطری ردِعمل ہے، جو گناہ یا غلطی سرزد ہوتے ہی ہر انسان کے اندر

خود بخود ایسے ہی ابھرتا ہے جیسے آگ میں ہاتھ ڈالنے سے درد اور جلن کا احساس۔اب اگر انسان اسے وقار اور بھرم اور انا کا مسئلہ نہ بنائے اور اپنی ساری توجہ اور توانائی بلا بحث اس احساس کے فطری تقاضے (مثلاً گناہ سے اجتناب، غلطی کی تلافی اور مغفرت طلبی وغیرہ) کے اوپر مرکوز کر دے؛ تو یہی احساسِ خطا سب سے بڑا شخصیت ساز عامل بن جاتا ہے۔جیسا کہ پہلے انسان آدمؑ کی زندگی میں ہوا اور اسی طرح تاریخ کے ہر دور میں آدم کے رول ماڈل کو اپنانے والے بے شمار سلیم الفطرت انسانوں نے اپنی امتیازی شخصیتوں اور میدانِ حیات میں اپنی ہمہ جہتی کامیابیوں کے ذریعہ بار بار ثابت کیا ہے۔

بروز سنیچر، ۱۸ر جون، ۱۳ر رمضان ۲۰۱۶ء

''احساسِ خطا'' ایک شخصیت ساز عمل (۲)

اسلامی تاریخ میں عمر بن عبدالعزیز، اس حقیقت کی ایک لازوال مثال ہیں کہ سچا 'احساسِ خطا' (یا خلشِ گناہ=Guilt)، جو آخرت میں خدا کی بازپُرس سے ڈر کا نتیجہ ہو؛ وہ انسانی شخصیت کو تمام نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک وصاف (Complex Free) رکھنے اور اسے ہر قسم کے اعلیٰ ربانی اوصاف اور روحانی اور اخلاقی کمالات کی جستجو میں ہر لحظہ بیکل اور سرگرمِ عمل بنانے کا سب سے طاقتور محرک ہوتا ہے۔

البخاری کی التاریخ الکبیر (جلد سوم، مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ، حیدرآباد، صفحہ ۲۰۸) کے مطابق، عمر بن عبدالعزیز جب مدینہ کے گورنر ہوا کرتے تھے تو اموی خلیفہ الولید بن عبدالملک کے حکم سے انہوں نے وقت کے معروف عالم اور فقیہ خُبیب بن عبداللہ بن الزبیر کو سو کوڑے لگوائے اور سخت سردی میں انھیں رات بھر کھڑا رکھا؛ جس کی وہ تاب نہ لا سکے اور چل بسے۔

خبیب کی موت اگرچہ بظاہر ایک اتفاقی واقعہ تھا، نیز ان کے خلاف یہ تادیبی کارروائی خلیفۂ وقت کے براہ راست حکم کی تعمیل میں کی گئی تھی جو اموی خاندان کے بارے میں ان کی جارحانہ تنقید سے سخت ناراض تھا۔مگر عمر بن عبدالعزیز نے ایک شریکِ کار ہونے کی حیثیت سے اس ''اجتہادی خطا'' اور اس کے تلخ نتیجہ کی اخلاقی ذمہ داری کسی بحث یا توجیہ یا تبریر (Justification) کے بغیر مکمل طور پر اپنے اوپر لے لی اور وہ اسے کبھی فراموش نہ کر سکے۔اس واقعہ کے بعد جب کوئی شخص ان

کے کسی بڑے نیک کام یا غیر معمولی دینی اور انسانی خدمت کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں نجات کی بشارت دیتا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتے کہ: "نجات کیسی، جبکہ خبیب راستہ میں حائل ہیں!" (فكان عمر إذا قيل له: أبشر. قال: كيف بخبيب على الطريق!)۔

گویا اپنی ''خطا'' کی سنگینی پر گہری ندامت کے احساس اور اس پر آخرت کی پکڑ سے بچنے کی سچی تڑپ نے انہیں بعد کے مرحلۂ حیات میں ہر طرح کی انانیت، خوش فہمی اور خود پسندی کے فریب سے بچایا اور اس کی ہر ممکن تلافی یا کفارہ کی خاطر انھیں تا عمر خوب سے خوب تر کی مثبت تلاش میں ہمہ وقت متحرک رکھا، جس نے بالآخر انھیں مسلمہ طور پر ''پانچواں خلیفۂ راشد'' اور پہلا ''مجددِ اسلام'' بنا دیا۔

بروز اتوار، ۱۹/ جون، ۱۴/ رمضان ۲۰۱۶ء

معافی کلچر

موجودہ زمانے کے نام نہاد سیکولر کلچر کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ روزمرہ معاملات میں ہر چھوٹی بڑی بات پر اپنی غلطی کو کسی تحفظ کے بغیر فوراً مان لینا اور متعلقہ فرد یا ادارہ یا گروہ سے کھلے لفظوں میں معافی مانگنا، شائستگی اور پختگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکاری دفتروں سے لے کر بازاروں تک، ہر جگہ اس قسم کے الفاظ بار بار سننے کو ملتے ہیں:

میں شرمندہ ہوں=I am sorry

میں مخلصانہ معذرت خواہ ہوں=I sincerely apologize

میں آپ سے معافی مانگتا ہوں=I beg your pardon

میں غلطی پر تھا=I was wrong

دراصل ساری غلطی میری ہی تھی= In fact, it was all my fault وغیرہ۔۔

کاروبار اور تجارت اور سیاست وغیرہ کے میدان میں تو 'معافی مانگنا' ایک مستقل آرٹ بن گیا ہے جس کے لئے کارندوں کو باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ملٹی نیشنل کمپنیوں اور کارپوریٹ آفسوں کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ''گاہک ہمیشہ درست ہوتا ہے'' (Customer

is always right)، بالفاظ دیگر، اگر کبھی کوئی اختلافی صورتِ حال پیدا ہو جائے، تو کمپنی کے ملازم کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ کسٹمر سے تکرار کرے؛ بلکہ اسے اپنے آپ کو غلط مان کر، معذرت کے ساتھ، کسٹمر کے حسبِ منشا اس معاملہ کا تصفیہ کرنا چاہئے۔

جدید کلچر کا یہ عجیب تضاد ہے کہ اس میں ''انسان'' کو راضی رکھنے اور وقتی کاروباری مفاد کے تحفظ یا تجارتی ''نقصان'' سے بچنے کی خاطر بلا بحث اپنی غلطی مان لینے اور معافی مانگنے کو بہت بڑا ہنر اور ''مہذب دنیا'' میں کامیابی و ترقی کا راز بتایا جاتا ہے۔ مگر اس کے علمبرداروں کی نگاہ میں بعینہ وہی رویہ جب خالص دینی عمل (توبہ و استغفار) کی شکل اختیار کرے؛ جس کا محرک ''خالقِ انسان'' کو راضی کرنا اور آخرت کے ''ابدی نقصان'' سے بچنا ہو؛ تو وہ نفسیاتی الجھنوں کا باعث ایک فعلِ معیوب اور انسانی شخصیت کے صحت مند ارتقاء میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے!!

لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آج عالمی کاروبار اور بین اقوامی تعلقات کی سطح پر چھایا ہوا یہ ''معافی کلچر=sorry culture''، تمام انسانیت کے اوپر خدا کا اتمامِ حجت ہے۔ کیونکہ خدا کو انسانوں سے یہی ''معافی کلچر=sorry culture'' دینی سطح پر توبہ و استغفار کی صورت میں مطلوب تھا تاکہ وہ آخرت میں اس کی خوشنودی اور اس کے ابدی عذاب سے نجات کے مستحق ٹھہریں۔ مگر انسانوں نے ''خالقِ انسان'' اور اس کے ساتھ حسنِ معاملہ کی اتنی پرواہ بھی نہ کی جتنی انہوں نے ''انسان'' کے معاملہ میں کی۔ اپنی انانیت اور عاجلہ پسندی کی بنا پر اس ''معافی کلچر'' کو انہوں نے صرف دنیوی میدان میں پورے جوش اور اخلاص سے اپنایا اور آخرت کے بارے میں بالکل بے حس بنے رہے۔

خود فریبی اور آخرت فراموشی پر مبنی اکثر انسانوں کی اسی مہلک ذہنی و عملی روش پر سورہ الکھف کی آیات 103-104 میں یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

''قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ، الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا''

(کہو: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹا اٹھانے والے کون ہیں؟ وہ جن کی

کوششیں دنیاوی زندگی میں کھو کر رہ گئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں)

بروز پیر، ۲۰ر جون، ۱۵ر رمضان ۲۰۱۶ء

شکریہ کلچر (۱ / ۲)

''معافی کلچر= Sorry Culture'' کی طرح، جدید عالمی تہذیب کا ایک اور نمایاں پہلو وہ ہے جسے ''شکریہ کلچر= Thank you Culture'' کہہ سکتے ہیں، جس کے لفظی اور غیر لفظی مظاہر روزانہ ہر جگہ اور ہر سطح پر بار بار دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ تجارت اور بزنس کے میدان میں ''شکرگزاری'' کی اہمیت اور ضرورت 'معافی مانگنے' سے بھی کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ سیلز مین اور ملازمین سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شوروم یا کمپنی میں آنے والے ہر کسٹمر اور وِزِٹر کو مسکراتے ہوئے 'تھینک یو' کہہ کر رخصت کریں؛ چاہے اس نے خریدی یا کوئی اور لین دین کا معاملہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ''غیر مشروط شکرگزاری'' کا یہ منظر دیکھ کر کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اس پالیسی کو شاید میرے محلے کے تجربہ کار گشتی فقیر بھی اپنے پیشہ کے لئے بہت مفید سمجھتے تھے، اسی لئے وہ اپنی صداؤوں کے شروع اور آخر میں قدرے زیادہ اونچے سُر میں یہ جملہ ضرور دہراتے: ''جو دے اس کا بھی بھلا؛ جو نہ دے اس کا بھی بھلا!''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ اپنی مروجہ عالمی شکل میں یہ ''شکرگزاری'' محض ایک سماجی اور کاروباری چلن ہے؛ جسے انسانوں نے باہمی تعلقات اور مشترک دنیوی مفادات کے تحفظ کے لئے ظاہری طور پر اپنا لیا ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ممنونیت اور احسان شناسی کے لطیف احساسات کا وہ اظہار جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ایک انسان کو اپنے محسن کی نسبت سے کرنا چاہئے۔ غالباً اس سطحی کاروباری رواج کے اثر سے مذہب پسند طبقہ بھی محفوظ نہیں؛ جس کے افراد اگرچہ صبح و شام 'الحمدللہ' اور 'سبحان اللہ' کا وظیفہ پڑھتے نظر آتے ہیں مگر اپنے محسنِ اعلی اور منعمِ حقیقی رب العالمین کے لئے مطلوب حمد و شکر کی روح سے وہ بھی اتنا ہی خالی ہیں جتنا عام دنیادار انسانوں کی اکثریت۔

سچ تو یہ ہے کہ شیطان کی پُرفریب وسوسہ اندازیوں کا شکار ہو کر (سورۃ الأعراف، آیت ۱۷)، انسان نے اپنے منعمِ حقیقی کا سچا شکر ہمیشہ بہت ہی کم کیا ہے؛ جبکہ وہی خدا کو اس سے ہمیشہ سب

سے زیادہ مطلوب ہے۔ چنانچہ قرآن نے انسان کو بالعموم اپنے پروردگار کے حق میں بے حد ناشکرگزار قرار دیا ہے (سورۃ العادیات، آیت ٦؛ سورۃ سبا، آیت ۱۳)۔

کافی غور و فکر کے بعد میں نے دریافت کیا کہ اپنے محسنِ اعلی کی ناشکرگزاری کی اس عام انسانی روش کی وجہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ اس حقیقت کا شعوری ادراک رکھتے ہیں کہ رب العالمین کو جو ''حمد و شکر'' مطلوب ہے اس کی کاشت کاری ''صبر'' کی زمین میں ہوتی ہے۔ جو شخص ہر حال میں رب کی خاطر ''صابر'' نہ ہو؛ وہ کسی بھی حال میں رب کا سچا ''شاکر'' نہیں ہو سکتا۔ صبر اور شکر دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کی روحِ رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر دونوں بے معنی اور بے نتیجہ۔ اس لئے ''شاکر'' ہونے کی خاص پہچان یہ ہے کہ انسان ''شاکی'' نہ ہو، نہ شدتِ حالات کا شاکی، نہ آلامِ روزگار کا۔ شکایت، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی جائز اور معقول ہو، بے صبری ہے اور بے صبری، رب العالمین پر ''بے اعتمادی'' کے مرادف؛ نیز اس کی مطلوب حمد و ثناء اور شکر و سپاس کے لئے زہرِ ہلاہل ہے۔ اسی لئے قرآن میں خدائی تجلیات اور نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی مقامات پر کہا گیا ہے کہ ان میں اس کے لئے نشانیاں ہیں جو بیک وقت ''صبار شکور'' یعنی ہمیشہ 'صبر۔شکر' کرنے والا ہے (سورہ سباء، آیت ۱۹؛ سورہ لقمان، آیت ۳۱؛ سورہ الشوری، آیت ۳۳)۔ اسی طرح پیغمبر کو ہر قسم کی ناخوشگوار حالت میں صبر کرتے ہوئے؛ صبح و شام اپنے رب کی حمد اور تسبیح میں سرگرم رہنے کی ہدایت بار بار دی گئی (سورہ طٰہ، آیت ۱۳۰؛ سورہ ق، آیت ۳۹)۔

بروز منگل، ۲۱ر جون، ۱۶ر رمضان ۲۰۱۶ء

شکریہ کلچر (۲ / ۲)

قرآن کا آغاز ''الحمدللہ رب العالمین'' سے ہوتا ہے یعنی ہر طرح کی تعریف و ستائش اور شکر و سپاس کے لطیف جذبات و احساسات اور والہانہ کلمات کا اصلی مستحق وہ خدا ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے۔ قرآن کے مطابق (سورۃ بنی اسرائیل، آیت 44)؛ زمین و آسمان کی ہر جاندار اور غیر جاندار مخلوق ہمہ وقت خدا کی تسبیح اور حمد میں مصروف ہے اور یہی ''حمدِ رب'' وہ آخری نغمہ ہے جسے

آخرت کی ابدی دنیا میں تمام فرشتے جنّتی انسانوں کے ساتھ مل کر وہاں کی لا فانی ربانی نعمتوں کے سائے میں ہمیشہ ہمیش گاتے رہیں گے (سورہ الزمر، آیت 75)۔ گویا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ''قرآنی کلچر'' ایک لفظ میں ''حمد کلچر'' یا ''شکریہ کلچر'' ہے۔

تاہم خدا کی مطلوب حمد اور شکر گزاری محض یہ نہیں ہے کہ آپ کو جب ایک خوشی کا تجربہ ہو، یا حسبِ توقع یا خلافِ توقع آپ کی آمدنی میں اچانک اضافہ یا پوزیشن میں غیر معمولی ترقی یا کوئی اور ظاہری نعمت حاصل ہو جائے تو آپ کیف و سرور اور بسا اوقات فخر و ناز کے ساتھ ''الحمد للہ'' اور ''اللہ ترا لاکھ لاکھ شکر ہے'' جیسے الفاظ زبان سے بے ساختہ دہرانے لگیں۔ لیکن جب صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو آپ سراپا غم و حسرت اور افسردگی و مایوسی کی تصویر بن جائیں اور قولاً یا فعلاً حالات کے خلاف شکایت و احتجاج کرنے لگیں، جو خدا کے فیصلہ پر اعتراض کے ہم معنی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا، سچی حمد اور شکر گزاری کی کسوٹی سچا ''صبر'' ہے۔ یعنی آپ کے خارجی حالات چاہے خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، مگر خدا کی نسبت سے آپ کی ذہنی کیفیات، اندرونی احساسات نیز آپ کے قولی اور عملی رویے میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ ہر طرح کے تلخ و شیریں احوال و ظروف میں جب آپ کے خیالات اور آپ سے صادر ہونے والے کلمات اور حرکات و سکنات میں وہی ربانیت اور آخرت پسندی کا رنگ ہو، آپ ہر صورتِ حال میں یکساں طور پر خدا کے ممنون اور محتاج بندے بن کر اس کی رضا جوئی کی خاطر دوسروں کے ساتھ تواضع اور خیر خواہی کا معاملہ کرتے رہیں؛ تب آپ کی حمد اور شکر گزاری ایک بامعنیٰ 'عبادت' بنتی ہے؛ ورنہ وہ ایک سطحی لفاظی پر مبنی سماجی عادت ہے یا ایک خود غرضانہ تجارت۔

اس اہم فیصلہ کن حقیقت کی طرف قرآن نے متعدد مقامات پر مختلف انداز سے توجہ دلائی ہے مثال کے طور ملاحظہ ہو: سورہ الفجر، آیت ۱۵-۱۶؛ سورہ المعارج، آیات ۱۹-۲۱؛ سورہ فصلت، آیت ۵۱؛ سورہ بنی اسرائیل، آیات ۸۳-۸۴، وغیرہ۔

خدائے رحمان و رحیم رات اور دن کی طرح، موجودہ دنیا میں ہر انسان کے اوپر کبھی اچھے اور

کبھی بُرے حالات طاری کرتا ہے تا کہ وہ ''صبر-شکر'' کی دوگونہ صفات کا پیکر بن کر اگلی دنیا میں ابدی جنت کی شہریت حاصل کر سکے۔ یہ انسان کے حسنِ فہم اور حسنِ عمل، دونوں کا بڑا کڑا امتحان ہے مگر اس کا اجر بھی اتنا ہی بے حساب حد تک بڑا ہے۔ نوحؑ کو قرآن میں ''عبداً شکوراً'' یعنی بہت زیادہ شکر گزار بندہ کہا گیا ہے (سورہ بنی اسرائیل، آیت ۳) کیونکہ ساڑھے نو سو سال تک انہوں نے اپنی قوم اور اپنے بعض اہلِ خانہ (بیوی اور ایک بیٹے وغیرھما) کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں پر صبر کیا۔ بالفاظ دیگر، وہ اپنی روزمرہ عملی زندگی میں ''عبدِ صبور'' تھے اس لئے وہ ''عبدِ شکور'' بن سکے۔

بروز بدھ، ۲۲/جون، ۱۷/رمضان ۲۰۱۶ء

سید الاستغفار: ایک انقلابی تصور

صحیح البخاری میں شداد بن اَوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "سید الاستغفار یہ ہے کہ بندہ یوں کہے: "اے اللہ، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں؛ اور میں اپنی استطاعت کے بقدر تیرے عہد اور وعدہ پر قائم ہوں۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس برائی سے جو میں نے کی ہے اور میں تجھ سے اپنے اوپر تیری نعمت کا اعتراف کرتا ہوں نیز میں اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہوں؛ لہٰذا تو مجھے بخش دے کیونکہ تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کی بخشش کر سکے۔ جو شخص پورے یقین کے ساتھ دن کے وقت ایسا کہے اور شام ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ جنتی ہے اور جو شخص پورے یقین کے ساتھ رات کے وقت ایسا کہے اور صبح ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ جنتی ہے''۔

(عنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رضی اللہ عنهُ عن النَّبِيِّ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّم قالَ: ''سيِّدُ الاسْتِغْفار أَنْ يقُول الْعبْدُ: اللَّهُمَّ أَنْت رَبِّي، لا إِلَه إِلاَّ أَنْت خَلَقْتَني وأَنَا عَبْدُكَ، وأَنَا على عهْدِكَ ووعْدِكَ ما اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّ ما صنَعْتُ، أَبوءُ لَكَ بِنِعْمتِكَ علَيَّ، وأَبُوءُ بذَنْبِى فَاغْفِرْ لى، فَإِنَّهُ لا يغْفِرُ الذُّنُوبِ إِلاَّ أَنْتَ. منْ قَالَهَا مِنَ النَّهارِ مُوقِناً بِهَا، فَمات مِنْ يوْمِهِ قَبْل أَنْ يُمْسِيَ، فَهُو مِنْ أَهْلِ الجنَّةِ، ومَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وهُو مُوقِنٌ بها فَمَاتَ قَبل أَنْ يُصْبِح، فهُو مِنْ أَهْلِ الجنَّةِ'' رواه البخاري)

یہ بظاہر چند الفاظ کا مجموعہ ہے،مگر اس میں تدبر کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عقیدہ وعمل کے وہ تمام انقلاب آفریں عناصر اس میں مرتکز ہو گئے ہیں، جو ایک فرد کی زندگی کو مکمل طور پر بدل کر اسے نیا ربانی انسان بنا دیتے ہیں: (۱) توحید کا اعلان، (۲) خالق کی حیثیت سے خدا کے ساتھ بندگی کے عہد و پیمان کا زندہ شعور اور اس کی ممکنہ ادائیگی کا عزم اور کوشش، (۳) اپنی بدعملی کی بنا پر عدمِ تحفظ کا احساس اور اس کے سنگین نتائج سے خدا کی پناہ مانگنا (۴) اعترافِ نعمت، (۵) اقرارِ گناہ اور (۶) اس بات کا پختہ یقین کہ گناہوں کی مغفرت اور ان کے مہلک نتائج سے حفاظت کرنا صرف خدا کے بس میں ہے۔

یہ برتر حقائق جس انسان کے شعور و ادراک کی گہرائی میں اتر جائیں، وہ زبان سے ان کا اظہار کرنے کے بعد اگر حیاتیاتی سطح پر نہ مرے؛ تب بھی فکری اور عملی اعتبار سے گویا کہ اس کا سابقہ وجود مر جاتا ہے اور وہ ازسرِنو ایک ربانی پیکر میں ڈھل کر نمودار ہوتا ہے؛ جس کا نصب العین جنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا جسم گو اب بھی زمین پر رہتا ہے مگر اس کی روح جنت کی فضاؤں میں بسیرا کرنے کے لئے ہمہ وقت بے قرار رہتی ہے اور بلا شبہ خدائے غفور و رحیم ایسے بندے کو اپنی مغفرت اور جنت سے محروم نہیں کرے گا۔

بروز جمعرات، ۲۳ر جون، ۱۸ر رمضان ۲۰۱۶ء

زندگی: ایک انمول ربانی عطیہ

آپ اس وقت زندہ ہیں اور اس قابل ہیں کہ یہ سطریں پڑھ سکیں؛ یہی بذات خود ناقابلِ بیان حد تک عظیم الشان اور بامعنی واقعہ ہے۔ جس کے بارے میں آپ جتنا بھی لفظی و غیر لفظی تحیر و استعجاب اور تشکر و امتنان کا اظہار کریں؛ کم ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کا یک طرفہ فضل و کرم ہے کہ اس نے آپ کو وجود بخشا اور اپنی عظیم تخلیقی اسکیم میں آپ کو ایک 'رول' ادا کرنے کا موقع عطا کیا۔ نیز اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ آپ کی رہنمائی کا انتظام کیا، اس رہنمائی کے آخری مستند اور ناقابلِ تحریف متن کو قرآن کی صورت میں محفوظ کر دیا تا کہ آپ اپنا 'مقررہ رول' ٹھیک ٹھیک انجام دے سکیں اور بالآخر موت کے بعد آنے والی ابدی دنیا میں جہنم کے گڑھے سے بچا کر جنت کے لافانی نعمتوں

بھرے باغات میں ہمیشہ کے لئے داخل کر دیئے جائیں۔

اس ضمن میں رب العالمین کی بے پناہ رحمت اور بے مثال عدل و انصاف کا ایک عجیب مظہر یہ بھی ہے کہ اس نے اگرچہ ایک انسان اور دوسرے انسان کو ظاہری شکل و صورت اور خارجی حالات کے لحاظ سے مختلف بنایا؛ مثلاً کوئی کالا ہے تو کوئی گورا، کوئی امیر ہے تو کوئی غریب، کوئی صاحبِ جاہ و اقتدار ہے تو کوئی بے حیثیت اور کمزور، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کی رضا اور جنت تک پہنچنے کا راستہ بلا امتیاز سب کے لئے یکساں طور پر کھلا اور ہموار بنایا۔ پھر اپنی تخلیقی اسکیم میں ہر ایک کی حیثیت و استطاعت کے دائرہ میں، سب کے لئے ایک ہی بنیادی 'رول' مقرر کیا اور وہ عبادت ہے (''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ''، سورہ الذاریات، آیت، ۵۶) اسی کے ساتھ اس 'رول' کے رد و قبول کا معیار بھی سب کے لئے ایک ہی طے کیا اور وہ ہے تقویٰ۔ جو ایک ممکن الحصول اندرونی روحانی و اخلاقی صفت ہے اور ہر وقت ہر شخص کی دسترس میں ہے؛ نہ کہ محض چند افراد پر منحصر کوئی خارجی مظہر یا مادی طاقت: (''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ''، سورہ الحجرات، آیت، ۱۳)

اگر اس نقطۂ نظر سے غور کریں؛ تو آپ سراپا عجز و نیاز بن کر اپنے خالق و مالک کی حمد و ثناء اور احسان مندی کے والہانہ احساسات میں ڈوب جائیں گے؛ کیونکہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت دنیا میں آپ جس جگہ اور جس حالت میں بھی اپنی زندگی گزار رہے ہیں؛ وہ ایک انمول ربانی عطیہ ہے؛ جو آپ کو ہر آنے جانے والی سانس کے ساتھ یہ بیش قیمت موقع فراہم کر رہا ہے کہ آپ اس زمین پر اپنے مقررہ رول (عبادت) کو ربانی معیار (تقویٰ) کے مطابق ادا کرنے کی اپنے بس بھر مخلصانہ سعی کریں، اور اس کے عوض خدا آپ کو جنت کے ابدی نعمت کدہ میں انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ رہائش کا شرف بخش دے (سورہ النساء، آیت ۶۹)۔

ایسی حالت میں یہ کیسی عجیب ہلاکت خیز نادانی ہے کہ اکثر انسان اپنی ساری ''زندگی'' خود ''زندگی'' کو بدلنے کی سعیٔ لاحاصل میں گنوا دیتے ہیں؛ جبکہ جو چیز اصلاً انھیں بدلنی تھی اور جس کو وہ بدل سکتے تھے وہ ''زندگی'' نہیں بلکہ ''زندگی'' کے بارے میں ان کا تصور اور عملی روش تھی۔

بروز جمعہ، ۲۴؍جون، ۱۹؍رمضان ۲۰۱۶ء

قرآن: انسانیت کے لئے شفاء اور رحمت

آج سے ساٹھ برس قبل جون 1956 میں امریکی ماہرِ نفسیات مائک گورمین (Mike Gorman) کی ایک معرکۃ الآراء کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ جس کا نام تھا: ''ہر دوسرا بستر = Every Other Bed''۔ اس کتاب میں طویل ریسرچ کے بعد اعداد وشمار کی روشنی میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ، سائنسی، صنعتی، اقتصادی اور عسکری، ہر اعتبار سے دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور، خوشحال اور ترقی یافتہ ملک کے اسپتالوں میں ہر دوسرے بستر پر ایک ایسا شخص لیٹا ہوا ہے جسے کوئی حقیقی بیماری نہیں؛ بلکہ وہ محض ایک نفسیاتی مریض (Psychiatric Patient) ہے۔

گزشتہ ساٹھ برسوں کے دوران، نہ صرف امریکہ، بلکہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں ذہنی ونفسیاتی مریضوں کی تعداد نیز ان کے درمیان خودکشی کرنے والے افراد کی شرح میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے؛ چنانچہ اس کے تدارک اور علاج کے پروگراموں کو، اقوام متحدہ کے تحت منظور شدہ بین اقوامی منصوبۂ ''پائیدار ترقی ۲۰۳۰'' (Sustainable Development 2030) کے سترہ اہم ترجیحی مقاصد میں شامل کیا گیا ہے (تفصیلات کے لئے دیکھئے: ۲۰۱۵ میں پیش کردہ عالمی تنظیمِ صحت (WHO) کی رپورٹ: بعنوان ''صحتِ دماغی کا اٹلس'' (Mental Health Atlas)۔

مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش عشرت کی بہتات کے باوجود، جدید تہذیب نے انسان کو ''ذہنی سکون'' (Peace of Mind) کم، اور ''ذہنی تناؤ'' (Mental Stress) زیادہ دیا ہے؛ جسے بیشتر نفسیاتی عوارض اور جسمانی بیماریوں کا بنیادی سبب بتایا جاتا ہے۔ اسی مسئلہ (ذہنی تناؤ) کے حل کی تلاش میں گزشتہ چند دہائیوں کے دوران عالمی سطح پر بالخصوص یورپ اور امریکہ میں روحانیت (Spirituality)، گیان دھیان (Meditation) یوگا، اور ''مذاہب وأسفار شرقیہ'' (Oriental Faiths & Scriptures)، بشمول قرآن مجید، کے مطالعے اور ان پر

عملی تجربات کو زبردست فروغ ملا ہے۔

اس موضوع پر آج غور کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ قرآن کی صرف تین مختصر سورتوں میں آج کی ''بے چین انسانیت'' (Restless Humanity) کے لئے شفاء اور رحمت کا پورا سامان موجود ہے:

۱-سورہ التکاثر، جس میں انسان اور انسانیت کے اصل روگ (زیادہ سے زیادہ کی حرص) کی صحیح تشخیص کی گئی ہے۔

۲-سورہ العصر، جس میں انسان اور انسانیت کے اصل روگ کا حتمی علاج بیان کیا گیا ہے؛ جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر قابلِ استعمال اور کارآمد ہے۔

۳-سورہ الفاتحہ، جو دعائیہ انداز میں گویا زیرِ علاج انسان اور انسانیت کو اپنے ''شافئ حقیقی اللہ رب العالمین'' سے مسلسل رابطہ (Round the Clock in Touch) میں رکھنے کا وسیلہ ہے تاکہ کسی بھی متوقع یا غیر متوقع صورتِ حال میں وہ اس کی رحیمانہ عنایت (Compassionate Care) کو طلب کر سکے۔

بروز سنیچر، ۲۵؍جون، ۲۰؍رمضان ۲۰۱۶ء

''استرجاع'': ایک ''زندگی بخش'' کلمہ

آج صبح ایک قریبی رشتہ دار کی خبرِ وفات ملی اور بے ساختہ زبان سے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' نکلا۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن (البقرہ، آیت، ۱۵۶) اور حدیث، دونوں میں اہلِ ایمان کو ہدایت دی گئی ہے کہ جب بھی وہ کسی کی موت کی خبر سنیں یا بذاتِ خود کسی قسم کی ناگہانی مصیبت یا حادثہ یا مالی نقصان وغیرہ سے دوچار ہوں؛ تو مذکورہ کلمہ کہیں، جس کا مطلب ہے: ''ہم اللہ کی مِلکیت ہیں اور اللہ ہی کے پاس ہمیں لوٹ کر جانا ہے''۔ اسے اسلامی اصطلاح میں ''استرجاع'' کہتے ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت میں، اس پر اس دعائیہ جملے کا اضافہ ہے: ''أللهم اجرني في مصيبتي وأخلف لي خيرًا

منہا'' یعنی 'اے اللہ، مجھے اس مصیبت کا اجر دے اور اس کی جگہ اس سے بہتر عطا کر'۔

یہ 'استرجاع' (یعنی "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' کہنا) بظاہر ایک کلمہ ہے جو زندگی کے منفی اور تکلیف دہ واقعات (موت، مصیبت، حادثہ، خسارہ وغیرہ) سے دوچار ہونے پر کہا جاتا ہے؛ مگر عام انسانی رجحان اور سماجی رواج کے بالکل برعکس؛ اس میں حسرت و افسوس یا رنج و ملال کے احساسات کا اظہار مطلق نہیں۔ بلکہ وہ حددرجہ 'زندگی بخش'، 'امید افزا' اور 'حوصلہ آفرین' ایمانی تصورات پر مبنی عبارت ہے۔ اسی لئے قرآن نے اسے سچے ایمان والے ''صابرین'' کا شعار بتایا ہے اور پیغمبر کی زبانی انھیں خدائی رحمتوں اور برکتوں کی خوشخبری دی ہے (البقرہ، آیت، ۱۵۵۔۱۵۷)۔ دوسری طرف حدیث میں کسی کی موت پر نوحہ و ماتم کرنے یا کسی المناک حادثہ پر واویلا مچانے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اسے 'عملِ جاہلیت' قرار دیا گیا ہے۔

جب ایک شخص گہرے شعور و اذعان کے ساتھ ''استرجاع'' کرتا ہے تو وہ گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ:

۱- اللہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور میں اور میری ہر شئے اسی کی علی الاطلاق ملکیت کا حصہ ہیں۔ اس لئے اس تکلیف دہ واقعہ یا نقصان کو میں اپنے مالک کی مشیت جان کر اسے بلا اعتراض تسلیم کرتا ہوں۔ (یہ اقرار دل ودماغ کو بیک وقت سکینت و اطمینان اور حوصلہ و امید سے بھر دیتا ہے)۔

۲- جو شخص یا چیز بھی مجھ سے جدا ہوئی یا چھن گئی؛ وہ حقیقتاً اپنے اصلی مالک (اللہ) کے حکم سے اس کے پاس واپس چلی گئی اور ٹھیک اسی طرح ہم سب کو بالآخر لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ لہذا مجھے اس واقعہ کو ''رب العالمین سے ملاقات کی یاددہانی'' سمجھنا چاہئے اور اسی فیصلہ کن گھڑی کی تیاری کے لئے اب پوری سنجیدگی اور مستعدی سے یکسو ہو جانا چاہئے۔

بنابریں، کسی جانی یا مالی خسارہ کے بعد ایک صاحبِ ایمان کے لئے غور طلب بات یہ نہیں کہ ایسا کیوں ہوا اور اگر یہ نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا- اس قسم کی بات کہنا یا سوچنا نہ صرف استرجاع کی اسپرٹ کے خلاف ہے، بلکہ نہایت غیر حقیقت پسندانہ ذہنیت کی دلیل ہے؛ جو نفسیاتی اور عملی ہر اعتبار سے انسان

کے لئے سخت تباہ کن ہے۔ یہ 'جاہلانہ رجحان' اصل خسارہ پر مزید ناقابلِ تلافی نقصانات کا اضافہ کرتا ہے۔ باشعور اور مخلصانہ استرجاع کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ انسان کسی موت یا صدمہ کے بعد اپنی بقیہ زندگی اور اپنے پاس باقی ماندہ متاع نیز اہل وعیال کی نسبت سے مزید حساس اور ذمہ دار ہو جائے، وہ اپنے وقت اور وسائل کو زیادہ منظم اور بامعنی طور پر اس طرح استعمال کرے کہ جلد یا بدیر جب وہ اپنے مالکِ حقیقی کے پاس واپس جائے تو وہ اس کے اعلی معیارِ کمال وجمال کے مطابق 'قابلِ قبول' ٹھہرے؛ یا کم از کم وہ اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کے نتیجہ میں اتنا فاسد اور ناکارہ نہ ہو چکا ہو کہ خدا اسے جہنم کے سوا کسی اور جگہ کے لائق نہ سمجھے۔

بروز اتوار، ۲۶/جون، ۲۱/رمضان ۲۰۱۶ء

قرآن کیسے سمجھیں؟

قرآن سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انسانی عقل کی محدودیت کی بنا پر، بعض قرآنی آیات کو پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں۔ ان کا تعلق زیادہ ترغیبی معاملات سے ہے؛ اس لئے ان کے بارے میں اجمالی فہم پر قناعت کرنا ہوگا۔ البتہ بیشتر قرآنی آیات کا تعلق انسان کی عملی صلاح اور اخروی فلاح کے بنیادی تقاضوں سے ہے جو نہایت واضح لفظوں میں ہیں اور ان کو مکمل طور پر سمجھا اور روزمرہ زندگی میں ان کے مطابق اپنے فکر وعمل کو ڈھالا جاسکتا ہے۔ یہی قرآن کا اصل مدعا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہماری کائنات کے فطری قوانین۔ ان کے بارے میں دنیا بھر کے بڑے بڑے عبقری سائنسداں مل کر بھی ایک فیصد سے زیادہ کچھ بولنے یا سمجھنے اور سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں- البتہ ان قوانین کے بالواسطہ عملی استعمالات یا تکنیکی اثرات کو وسیع پیمانہ پر مشاہدے اور تجربے کا موضوع بنا کر انسانی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

اب اس اصول کو منطبق کرتے ہوئے سورہ التکویر اور سورہ الانفطار پر غور کیجئے۔ دونوں سورتوں کا کم وبیش ایک تہائی حصہ قیامت کے مختلف ہولناک مراحل کی تصویر کشی پر مشتمل ہے، جن کا بر

حق ہونا ہمیں ایسے ہی مان لینا ہے جیسے ہم ننانوے فیصد کائناتی "حقائق" کو براہِ راست دیکھے اور جانے بغیر انھیں مسلمات کی طرح مانے ہوئے ہیں اور اسے عین عقل و دانش کا تقاضہ سمجھتے ہیں۔

دونوں سورتوں کی بقیہ آیات کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ قیامت کے بعد انسان کی ابدی کامیابی یا ابدی بربادی کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی ''ابرار'' کی طرح جیتا ہے یا ''فجار'' کی طرح۔ گویا موجودہ دنیا وہ 'کارخانہ' ہے جس میں ہر انسان یا تو اپنی قیامت کے بعد کی لازوال زندگی کو کامیاب اور پُرمسرت بنا رہا ہے یا ناکام اور حسرت آمیز۔ چنانچہ قیامت آتے ہی ہر نفس کو فرداً فرداً اس کی اپنی عمر بھر کی کارگزاری اور اس کے آخری نتیجے سے آگاہ کر دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: ''علمت نفس ما أحضرت'' (التکویر، آیت ۱۴) اور ''علمت نفس ما قدمت وأخرت'' (الانفطار، آیت ۵)۔

ان سورتوں کا پیغام مختصراً یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ قیامت کا طوفان آکر نظامِ کائنات کو تہ و بالا کر دے؛ موجودہ زندگی کے ہر لمحے کی قدر کیجئے۔ یہ لمحے اگرچہ فانی ہیں؛ مگر انہیں لمحوں کے درست یا نادرست استعمال سے آپ اپنی آنے والی لافانی زندگی کو آباد یا برباد کر رہے ہیں۔

بروز پیر، ۲۷ر جون، ۲۲ر رمضان ۲۰۱۶ء

لیلۃ القدر ''روحِ اسلام'' کا کائناتی مظاہرہ

اسلام کی اصل روح، ''تسلیم و رضا'' (Surrunder & Acceptance) ہے، یعنی زندگی کے ہر معاملہ میں ذہنی سوچ سے لے کر قلبی جذبات وواردات، ارادی اقوال وافعال اور غیر ارادی حرکات وسکنات تک کو بلا مزاحمت رب العالمین کی مشیئت کے تابع اور اس سے ہم آہنگ کر لینا؛ یا کم از کم اس ہم آہنگی کی مسلسل شعوری کوشش کرنا۔ ''تسلیم و رضا'' کے اصول کو برتنے کی اس سنجیدہ شعوری کوشش کا نام قرآنی اصطلاح میں تزکیہ ہے اور اسی کوشش میں کامیابی کے تسلسل اور تناسب کے بقدر وہ نادر اور بیش قیمت روحانی تجربہ حاصل ہوتا ہے جسے ''ربانی معرفت'' کہتے ہیں؛ جو حکمت و بصیرت اور اعلیٰ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔

اس اعتبار سے ''تسلیم و رضا''، عینِ عبدیت اور بندگی ہے۔ نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور دیگر

عبادات و شعائر کا مقصود ''اسلام'' کی اسی روح یا جوہر کو نمایاں اور راسخ کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تمام اسلامی اعمال، عبادات اور دینی سرگرمیاں، اپنی ظاہری خوشنمائی کے باوجود، ایسے ہی بے جان اور بے اثر ہیں جیسے کاغذ کے خوش رنگ پھول۔

خدا کے تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی ''روحِ اسلام'' کا عملی نمونہ پیش کیا، جس کا آخری مستند ترین مظاہرہ پیغمبرِ اسلام کے اسوۂ حسنہ کی شکل میں ہوا۔ اس پہلو سے قرآن میں ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی تحسین کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: ''جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابع ہو جا؛ تو اس نے کہا کہ میں رب العالمین کا تابع بن گیا (یعنی سراپا تسلیم و رضا بن کر اس کی مشیئت کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا) (إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (سورہ البقرہ، آیت، 131) اس کے بعد کی آیات (البقرہ 132-137) میں مزید بتایا گیا ہے کہ تسلیم و رضا کے اسی اسوۂ ابراہیمی کو اختیار کرنا؛ اسی پر جینا اور اسی پر مرنا، بلا استثناء سارے انبیاء اور صلحاء کا نصب العین رہا ہے اور وہی ہر مسلمان سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں مطلوب ہے۔

درحقیقت ساری کائنات کا نظام اتنے محکم اور پُرامن طور پر اسی لئے چل رہا ہے کہ وہ 'روحِ اسلام' پر قائم یعنی اپنے خالق و مالک کی مشیئت کے ساتھ کلی طور پر ہم آہنگ ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی بھی سکینت اور سلامتی سے بھرپور اور ہر قسم کے فساد اور بدنظمی سے خالی ہو سکتی ہے؛ اگر وہ اس ''روحِ اسلام'' کو اپنا لے جس کو بیان کرنے کے لئے لیلۃ القدر میں قرآن اتارا گیا اور خود لیلۃ القدر کو فرشتوں اور جبریل کے ذریعہ اسی روحِ اسلام کا کائناتی مظاہرہ بنا دیا گیا۔ گویا ایک صاحبِ ایمان اپنے وجود کو شعوری سطح پر ''تسلیم و رضا'' کے سانچے میں مسلسل ڈھالنے کا جس قدر حوصلہ اور سعی کرے گا؛ کم و بیش اسی تناسب سے اس کے اندر قرآن اور لیلۃ القدر کی ربانی تجلیات کو محسوس کرنے، دیکھنے اور ان سے فیض یاب ہونے کی صلاحیت بیدار ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

بروز منگل، ۲۸ رجون، ۲۳ ررمضان ۲۰۱۶ء

تزکیۂ نفس کیا ہے؟ (۱/۲)

’تزکیہ‘ کا لفظ ’زکاۃ‘ سے بنا ہے، جس کے معنی میں بیک وقت پاکیزگی (Purity) اور نشوونما (Growth & Development) دونوں پہلو سبب اور نتیجہ کے طور پر شامل ہیں؛ گویا ایک کے بغیر دوسرے کا حصول ممکن نہیں۔ جس طرح ایک عمدہ فصل یا پھل دار درخت کی بھرپور نشوونما کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آپ اچھی (زرخیز) مٹی، اچھے بیج اور اچھی کھاد اور پانی وغیرہ کا انتظام کریں؛ بلکہ یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ آپ اس کے گرد و پیش کو کیڑے مکوڑوں، خودرو پودوں اور آندھی اور طوفان وغیرہ کی زد سے مسلسل محفوظ رکھنے کی تدابیر کرتے رہیں؛ ورنہ خدشہ ہے کہ آپ کی ساری محنت آپ کی فصل اور درخت کے پھلنے پھولنے سے پہلے ہی اکارت ہوجائے گی۔ ٹھیک یہی معاملہ نفس کے تزکیہ کا ہے۔

عربی گرامر کی رو سے ’تزکیہ‘ میں شدتِ اہتمام (Intensive Care) اور تسلسل (Consistency) کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی نفس کی پاکیزگی اور نشوونما کا یہ عمل، کوئی موسمی (Occasional) سرگرمی یا رسم نہیں؛ جس کو محض ایک یا چند مخصوص اوقات میں کر دینا کافی ہو؛ بلکہ وہ ایک تاعمر جاری رہنے والا عمل (Life-long Process) ہے۔ اس اعتبار سے روحانی اور اخلاقی سطح پر ’تزکیۂ نفس‘ وہی چیز ہے جسے آج کل عالمی ماہرین، کامیاب تجارت اور معیاری تعلیم کا سب سے بڑا راز بتاتے ہیں اور اسے تاحیات سیکھتے رہنا (Life-long Learning)؛ ذاتی قدر پیمائی (Self Evaluation) اور مسلسل عملی اور پیشہ ورانہ ارتقاء (CPD) وغیرہ ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔

بروز بدھ، ۲۹ رجون، ۲۴ ررمضان ۲۰۱۶ء

تزکیۂ نفس کیا ہے؟ (۲/۲)

تزکیہ کتنا اہم دینی عمل ہے، اس کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ قرآن نے اسے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (سورہ البقرہ، آیت ۱۲۹ اور ۱۵۱؛

سورہ آل عمران، ۱۶۴؛ سورہ الجمعہ، آیت، ۲)۔ پھر جنت کے ابدی باغات کو ان لوگوں کی جزا قرار دیا ہے ’جنہوں نے اپنا تزکیہ کیا‘ (سورہ طٰہٰ، آیت، ۷۶)۔ سورہ الاعلیٰ (آیت، ۱۴) میں یہی بات مزید تاکید کے ساتھ یوں بیان ہوئی ہے: ”قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ“، یعنی ’یقیناً اس نے فلاح پالی؛ جس نے اپنا تزکیہ کیا‘۔

تاہم قرآن (سورہ البقرہ، آیت، ۱۷۴؛ سورہ آل عمران، آیت، ۷۷) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ’تزکیۂ نفس‘ کے عمل کی تکمیل آخرت میں براہِ راست خدا کرے گا۔ گویا اس دنیا میں پیغمبر کے ذریعہ یا پیغمبرانہ اسوۂ حسنہ کے مطابق ایک صاحبِ ایمان صرف تاعمر اپنے نفس کے تزکیہ کی پیہم سعی و کوشش کرسکتا ہے، یہ سعی و کوشش جس حد تک رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہوگی؛ اسی حد تک وہ آخرت میں خدا کے نزدیک قابلِ قبول اور کامل ٹھہرے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ تزکیہ کے عمل کی اصل نوعیت کیا ہے؟ بالفاظ دیگر، نفس کی وہ کیا کمزوری یا منفی صفت ہے جس سے اسے ”پاکیزہ“ بنانے کی ہمیں فکر و کوشش کرنی ہے تاکہ اس کے اندر موجود اعلیٰ روحانی صفات اور ربانی امکانات ضائع نہ ہوں اور انھیں بھرپور نشوونما کا موقع ملتا رہے۔

تزکیۂ نفس کا عمل درحقیقت اپنے آپ کو اس بھرم اور خوش فہمی سے بچانا ہے کہ میں ’برگزیدہ‘ اور ’پاکیزہ‘ ہوں۔ ”احساسِ برگزیدگی“ یا اپنی پاکیزگی کا زُعم، خواہ کسی درجہ میں ہو، وہ سب سے بڑا مہلک نفسیاتی روگ ہے؛ جو انسان کی حقیقی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی ارتقاء کے تمام فطری امکانات کو کھا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، خودفریبی، خودنمائی اور خودستائی کے شیطانی جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ پھر اسے اپنا عیب بھی ہنر اور اپنے نقائص بھی کمالات دکھائی دیتے ہیں؛ چنانچہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی تہذیب و اصلاح کی مطلق ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے ناصح اور مصلح کو اپنا سب سے بڑا دشمن اور بدخواہ خیال کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس مزاج کے زیرِ اثر، وہ روحانی شعور اور فکر و کردار کی سطح پر جہاں اور جس حالت میں ہوتا ہے؛ اس سے نکلنے یا اسے بدلنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا۔

میں سمجھتا ہوں پیغمبرِ اسلام (ﷺ) نے قرآن کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کی جو بے مثال ربانی نسل تیار کی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اندر سے ''برگزیدگی'' اور ''پاکیزگی'' کے ہر احساس اور بھرم کو شعوری طور پر کھرچ کر نکال دیا تھا اور اس کی جگہ خدا کے سامنے ''جوابدہی'' کے احساس کو اپنے اندرون کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ اس لئے ان کے درمیان تزکیۂ نفس کا عمل بلا انقطاع جاری رہا۔ اس سلسلہ میں ان کے فکر ونظر کا معیار یہ قرآنی آیت تھی: '' أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ '' (سورہ النساء، آیت، 49) یعنی 'کیا تم نے ان کو دیکھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے پاکیزگی عطا کرتا ہے'۔

اس قرآنی مزاج کا اثر صحابہ کے بعد مزید دو نسلوں تابعین اور تبع تابعین کے اوپر بھی غالب رہا اسی لئے ان کا شمار ''خیر القرون'' میں ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے یہاں چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

۱- صحیح البخاری میں ایک باب کا بہت بامعنی اور فکر انگیز عنوان یہ ہے: ''باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر ''، یعنی مؤمن کا اس بات سے ڈرتے رہنا کہ اس کا نیک عمل رائیگاں ہو جائے اور اس کو احساس تک نہ ہو۔

۲- حسن بصری کا قول ہے کہ: ''مؤمن کو جب بھی دیکھو وہ ہمیشہ اپنے تئیں ملامت کرتا ہوا نظر آئے گا، مثلاً وہ کہے گا: میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس سے میرا ارادہ کیا تھا؟ اس عمل سے کہیں بہتر کرنے کا کام تو یہ تھا، وغیرہ''۔ نیز وہ کہا کرتے تھے کہ ''مؤمن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نفاق میں مبتلا ہونے سے ڈرتا رہتا ہے؛ جبکہ منافق وہ ہے جو اس پہلو سے بالکل مطمئن ہوتا ہے''۔

۳- ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں: ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابیوں کا زمانہ پایا ہے ان میں ہر کوئی اپنے اوپر نفاق کا خطرہ محسوس کرتا تھا اور ان میں کسی کو یہ دعوی نہیں تھا کہ اس کا ایمان جبریل ومیکائیل کے درجہ کا ایمان ہے''۔

خلاصہ یہ کہ تزکیۂ نفس کا عمل از اول تا آخر یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کا ہر لحہ 'احساسِ جوابدہی'

(Sense of Accountability) کے تحت خود احتسابی کرتے ہوئے گزاریں اور اپنے اندر کبھی احساسِ برگزیدگی (Sense of Chosen-ness) یا زُعم، پاکیزگی نہ پیدا ہونے دیں۔ اسی عمل نے ''خیر القرون'' کو خیر القرون بنایا اور اسی کے فقدان نے بعد کے دور کو شر القرون بنا دیا۔

بروز جمعرات، ۳۰/ جون، ۲۵/ رمضان ۲۰۱۶ء

قرآن: آپ کے حق میں یا آپ کے خلاف!

امام مسلم نے کتاب الطہارہ کے ذیل میں پانچ لفظوں پر مشتمل ایک حدیث یوں نقل کی ہے: ''القرآن حجة لك أو عليك '' ...... یعنی: 'قرآن یا تو تمہارے حق میں ایک حجت ہے یا تمہارے خلاف'۔

اس وقت جبکہ تمام مسلم دنیا؛ خصوصاً برِّ صغیر کے مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ''ختمِ قرآن'' کی سرگرمی پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری ہے (جیسا کہ ہر سال رمضان المبارک میں ہوتا ہے)؛ مذکورہ حدیث ہمیں ایک سنجیدہ دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور اسی کے ساتھ ایک نہایت سنگین وارننگ بھی۔ غالباً اسی حدیث کے پیشِ نظر، جلیل القدر فقیہ صحابی عبداللہ بن مسعودؓ اکثر کہا کرتے تھے کہ: ''إن أقواماً يقرؤون القرآن ولا يجاوز تراقيهم ''؛ ('بہت سے لوگ ہیں جو قرآن تو پڑھتے ہیں مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہیں جاتا')۔

مذکورہ حدیثِ رسول اور قولِ صحابی کی روشنی میں میں نے کچھ طالبِ علموں کو نصیحت کرتے ہوئے ایک بار کہا کہ: قرآن کا سچا قاری وہ ہے، جو قرآن پڑھنے کے بعد 'دوسروں' سے پہلے خود 'اپنے' خلاف 'اعلانِ جنگ' کر دے۔ جب ایسا ہو تو گویا فی الواقع قرآن آپ کے حلق سے گزر کر آپ کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر گیا اور آپ کے فکر وعمل کی انقلابی تشکیلِ نو کرنے لگا۔ اس وقت بلاشبہ حدیث کے مطابق قرآن آپ کے حق میں حجت ہے۔ اس کے برعکس اگر قرآن پڑھ کر آپ پہلے جہاں اور جس حالت میں تھے؛ وہیں اور اسی حالت میں پڑے رہیں یا اسے 'دوسروں' کے خلاف کسی خودساختہ قسم کی بظاہر انقلابی یا اصلاحی مگر عملاً تخریبی کارروائی کی بنیاد بنالیں؛ تو ایسی صورت میں وہ آپ

کے خلاف حجت ہوگا۔ آپ اگرچہ اپنی اس تخریبی کارروائی کے جواز میں بعض قرآنی آیات کا حوالہ دیں گے مگر وہ حضرت امام علیؓ کے اس مشہور حکیمانہ قول کا مصداق ہوگا کہ ’’بات تو حق کی ہے؛ مگر اس کا مدعا باطل ہے‘‘ (كلمة حق أريد بها الباطل)

نزولِ قرآن سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اکثر غارِ حراء میں کئی کئی دن معتکف ہوکر غور وفکر کرتے تھے۔ مگر نزولِ قرآن کے بعد دوبارہ آپ نے کسی غار میں عزلت نشینی اختیار نہیں کی۔ اسی طرح نزولِ قرآن کا اولین تجربہ آپ کے لئے اتنا شدید اور پُرہیبت تھا کہ اس کے اثر سے آپ چادر اور کمبل اوڑھ کر اپنے گھر میں پڑ گئے۔ مگر اللہ تعالی نے آپ کو آگاہ کیا کہ آخری آسمانی کتاب کا حامل بننے کے بعد آپ کا کام گھر میں بیٹھنا یا چادر اوڑھ کر لیٹ جانا نہیں بلکہ ہمہ تن سرگرمِ عمل ہوجانا ہے۔ چنانچہ حکم ہوتا ہے کہ آپ اٹھیں اور قرآن کے مطابق خود اپنے روحانی و اخلاقی جوہر کو آشکارا کرنے کے ساتھ ساتھ ساری انسانیت کے فکر وکردار کی تطہیر اور اس کی از سرِ نو تعمیر کے جاں فشاں کام کا بیڑہ اٹھائیں۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ کام تیئیس سالہ انتہائی پُرمشقت داخلی اور خارجی جہاد اور بے پناہ قربانیوں کے بعد ایک عظیم الشان عالمگیر انقلاب کی شکل میں پایۂ تکمیل تک پہنچا، جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہ اس سے پہلے دیکھی گئی نہ اس کے بعد۔

قرآن کا مطلوب اس کے ہر قاری سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں بنیادی طور پر وہی ہے جو اس کے پہلے قاری سے تھا۔ اگر اس کو پڑھ کر آپ کی سوچ، آپ کی عملی روش، آپ کا نظام الاوقات، آپ کے انسانی تعلقات، آپ کی ترجیحاتِ زندگی اور آپ کی پسند وناپسند کے معیارات اس کے مطابق نہ بدلے؛ تو وہ آپ کے خلاف خدا کی حجت ہے، بظاہر ’حاملِ قرآن‘ اور ’قاریٔ قرآن‘ ہوکر بھی آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کی شکایت خود پیغمبر نے اپنے رب کی عدالت میں اس طرح درج کرائی ہے: اور رسول نے کہا کہ اے میرے پروردگار، میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز بنا رکھا ہے۔ (وَقَالَ الرَّسُولُ يَارَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (سورہ الفرقان، آیت ۳۰)

معرفت کی کلید

سننِ ابن ماجہ میں ہے کہ اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو میں کیا دعاء کروں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یوں کہو: ’’اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي (یعنی: اے اللہ، تو بہت عفو و درگزر کرنے والا ہے اور عفو ودرگزر کو پسند کرتا ہے، لہذا میرے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ فرما‘‘۔ جامع الترمذی کی روایت میں ’’کریم‘‘ بمعنی: ’’عالی ظرف، مہربان‘‘ کا اضافہ ہے اور دعاء یوں ہے: (اللهم إنك عفو كريم تحب العفو فاعف عني)

جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، لیلۃ القدر وہ رات ہے جس میں اللہ کے ’تمام حکیمانہ فیصلوں کا تصفیہ ہوتا ہے‘ (سورہ الدخان، آیت ۴)۔ اس میں طلوعِ فجر تک جبریل سمیت خدا کے خاص فرشتے اپنے رب کے احکامات لے کر اترتے رہتے ہیں اور اس کے اثر سے پوری کائنات امن وسلامتی کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک رات میں قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔ اپنی استثنائی برکتوں اور فضیلتوں کی بنا پر یہ رات ’ایک ہزار مہینے‘ سے بہتر ہے (سورہ القدر)۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مذکورہ دعاء بظاہر ’بہت کم‘ معلوم ہوتی ہے۔ غالباً ایک عام آدمی یہ سوچے گا کہ جب موقع اتنا مبارک ہے اور دینے والا اس قدر فیاض؛ تو صرف ’عفو ودرگزر‘ کی ایک طلب پر اکتفاء کیوں؟ ہمیں ’سب کچھ‘ اور ’بے حد وحساب‘ مانگ لینا چاہئے!

اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہر آدمی اپنے ذوق اور ضرورت اور امید اور حوصلہ کے لحاظ سے دین ودنیا سے متعلق کسی بھی جائز چیز کی دعاء کرے۔ مگر میں سمجھتا ہوں مذکورہ دعائے لیلۃ القدر کی شکل میں اہلِ ایمان کو ربانی معرفت کی وہ بنیادی کلید دی گئی ہے جس کا شعوری ادراک ہونے کے بعد ’’کچھ اور مانگنے‘‘ کی فکر کم بلکہ شاید بالکل ختم ہوجاتی ہے، اس کی جگہ یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ دینے والا دراصل ہمیں ہمارے حوصلے اور مانگ اور ضرورت سے کہیں بڑھ کر عملاً دے چکا ہے اور دیتا رہتا ہے نیز اپنے

فضل وکرم سے مزید نوازنے کے لئے تیار ہے؛ مگر ہم خود اپنی بے شعوری اور غفلت سے اس کے ہر لحظہ برسنے والے فیض کی ناقدری کرتے ہیں اور اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے ہیں؛ جو گویا دانستہ یا نادانستہ اس کی فیاضی اور مہربانی کی ''تحقیر واہانت'' کے ہم معنی ہے؛ جس کو وہ رحمن ورحیم اگر نظر انداز نہ کرے، تو جو کچھ اس وقت ہمارے پاس ہے وہ بھی چھن جائے اور ہم سخت عذاب کی گرفت میں آجائیں۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ فاطر (آیت ،45) میں اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا اگر انسانوں کی عام کمائی یا کارگزاری پر مواخذہ کرنے لگے تو روئے زمین پر کوئی چلتا پھرتا نہ بچے۔ چنانچہ لیلۃ القدر جیسے مبارک ترین موقع کی دعاء کا مرکز ومحور اس سے بہتر کوئی نہیں ہوسکتا کہ بندہ اپنے رب سے کہے کہ: خدایا، میں سرتاپا تقصیر اور کوتاہی میں غرق ہوں۔ حتی کہ میری عبادت بھی بے شمار 'نقائص' سے پُر ہوتی ہے اور اس طرح وہ عبادت کے بجائے تیری ''معصیت اور اہانت'' کہلانے کی مستحق ہے، لیکن تو سراپا عفوودرگزر ہے لہذا میں اس کے سوا کچھ نہیں مانگتا کہ تو میری معصیتوں اور ناقص عبادتوں، دونوں سے عفوودرگزر فرماتے ہوئے مجھے اپنے رحم وکرم کی آغوش میں پناہ دے دے۔ (آمین!)

بروز سنیچر، ۲؍جولائی، ۲۷؍رمضان ۲۰۱۶ء

اگر آپ آگے نہیں بڑھ رہے؛ تو آپ پچھڑ رہے ہیں! (۱/۲)

نزولِ قرآن کی ابتدا آج سے ٹھیک ساڑھے چودہ سو برس پہلے مکہ کے ایک دور افتادہ تاریک غار میں ہوئی۔ یہ پوری تاریخِ بشری کا نہایت استثنائی واقعہ ہے کہ چوتھائی صدی سے بھی کم مدت (صرف ۲۳ سال) میں اپنی تدریجی تکمیل کے ساتھ، قرآن نے، اپنے دعوے کے عین مطابق، انسانیت کو ''تاریکیوں'' سے نکال کر ''روشنی'' میں پہنچا دیا۔ اس ''روشنی'' کو پاکر جزیرۂ عرب کے ''اُمّی لوگ'' (illiterate people) دینی و دنیاوی، ہر معاملہ میں اپنے وقت کے ''امام'' (leaders) بن گئے۔ قرآن کی ''روشنی'' پر مبنی، حاملینِ قرآن کی یہ امامت یا قیادت کم وبیش ایک ہزار سال تک ساری آباد دنیا پر براہِ راست یا بالواسطہ قائم رہی۔

قرآن کے اولین قارئین کس طرح اس قابل ہوئے کہ ایسے ہمہ گیر انفرادی اور اجتماعی

انقلاب کے بانی اور عالمی قائد بن جائیں؟ میری نظر میں اس کا مختصر جواب چار لفظوں میں یہ ہے: خدا شناسی، خود شناسی، وقت شناسی اور آخرت شناسی۔ قرآن اپنے ہر سنجیدہ قاری کو یہی چہار گونہ حرکی ذہنیت (Four Dimensional Dynamic Mind-set) دیتا ہے، جو اگر صحیح معنوں میں پیدا ہوجائے تو پھر قرآن کا قاری وہ نہیں رہ جاتا؛ جو وہ پہلے تھا، نیز اپنے ساتھ ساتھ وہ اپنے گرد وپیش کی مادی اور انسانی دنیا کو بھی اس کی ''موجودہ یا سابقہ'' حالت سے ہر ممکن پہلو سے بہتر دیکھنے اور بہتر بنانے کے لئے بے قرار ہوجاتا ہے۔

خدا شناسی، خود شناسی، وقت شناسی اور آخرت شناسی پر مبنی قرآن کی یہ چہار گونہ حرکی ذہنیت جب کسی فرد یا مجموعۂ افراد میں ابھرتی ہے تو ان کی زندگی سے یک لخت سکون اور جمود اور ٹھہراؤ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ وہ ہر قسم کی سُستی اور کاہلی اور بے عملی اور تن آسانی کی غیر ذمہ دارانہ اور تباہ کن روش سے ایسے ہی بھاگتے اور خدا کی پناہ مانگتے ہیں جیسے کوئی صحت مند شخص کوڑھ اور سرطان جیسے امراضِ خبیثہ سے بھاگے اور خدا کی پناہ مانگے۔ زندگی کا، بلکہ زندگی کی ہر سانس کا پہلا اور آخری مصرف ان کی نظر میں صرف ایک ہوجاتا ہے اور وہ ہے: حسنِ عمل، اخلاصِ عمل، تنقیدِ عمل اور تحسینِ عمل کی مسلسل کاوش کرنا۔

بروز اتوار، ۳؍جولائی، ۲۸؍رمضان ۲۰۱۶ء

اگر آپ آگے نہیں بڑھ رہے؛ تو آپ پچھڑ رہے ہیں! (۲/۲)

مذکورہ رجحان کے تحت، قرآن میں سنجیدہ تدبر کرنے والے قارئین وسامعین کے ذہنوں میں ہر وقت کچھ اس قسم کے خیالات واحساسات امنڈتے رہتے ہیں:

۱۔ ہماری کائنات معجزاتی حد تک بامعنی اور حسین ہے۔ اس میں کہیں کوئی خلل یا بدنظمی نہیں۔ اس کی ہر شئے کا ایک مقصد ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ ایک باقاعدہ نظام کی پابند ہوکر اپنے دائرۂ کار میں ہر وقت متحرک رہتی ہے۔ یہ گویا انسان کے لئے خالق کا ایک خاموش پیغام ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے مقصدِ اعلی کو جانے اور اس تک پہنچنے کے لئے یکسوئی کے ساتھ ہمیشہ منظم طور پر رواں دواں رہے۔

۲۔ یہاں جس طرح ہر کام کا ایک وقت ہے؛ اسی طرح ہر وقت کا ایک کام ہے۔ کسی کام کو اس کے مقرر

وقت پر بحسن وخوبی وہی انجام دے سکتا ہے جو ہر وقت کے کام کو بروقت جاننے اور اسے کما حقہ پورا کرنے کی سعی کرتا ہے۔

۳-اگر آپ آج وہاں نہیں ہیں؛ جہاں اپنی تخلیق کے مقصدِ اعلیٰ کی نسبت سے آپ کو آج ہونا چاہئے تھا؛ تو گویا آپ کل تک وہاں تھے جہاں آپ کو کل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اگر آپ اپنے ہر دن، بلکہ اس کے ہر لمحے کو اپنے ہر گزرے ہوئے کل اور اس کل کے ہر لمحے سے بہتر بنانے کی سنجیدہ اور پیہم کوشش میں مصروف نہیں؛ تو عملاً آپ اپنے آپ کو مسلسل کھونے کے عمل میں مصروف ہیں۔ ایسی حالت میں آپ آج وہ بھی نہیں ہو سکتے جو آپ گزشتہ کل تک تھے؛ اور آئندہ کل آپ وہ بھی نہ رہ سکیں گے جو آپ آج ہیں۔

۴-اگر آپ فکر وشعور اور کردار وعمل کی سطح پر مسلسل آگے کی سمت نہیں بڑھتے تو لازماً آپ ہر سطح پر مسلسل پچھڑتے جا رہے ہیں۔ اگر آپ لحظہ بہ لحظہ 'سنورتے اور نکھرتے' نہیں؛ تو ہر گزرتی ہوئی ساعت کے ساتھ آپ 'بگڑتے اور گدلاتے' جاتے ہیں اور انجامِ کار آپ کا حال آپ کے ماضی سے اور آپ کا مستقبل آپ کے حال سے زیادہ تاریک اور بدتر ہوتا جاتا ہے۔

۵-آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے، سنورنے اور نکھرنے یا بگڑنے اور گدلانے کی یہ دونوں ہی حالتیں آپ کی اپنی خود ارادیت پر مبنی ایک آزادانہ انتخاب ہے۔ آپ کے اسی آزادانہ انتخاب کی نوعیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کس حد تک خدا شناس، خود شناس، وقت شناس اور آخرت شناس ہیں؛ یا کس حد تک ان حقائق کی قدر وقیمت اور فیصلہ کن اہمیت سے ناآشنا یا ان کے منکر ہیں تاکہ بالآخر آپ کے اسی انتخاب کی بنیاد پر آپ کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے۔

اسی ذہنی رجحان کو ابھارنے اور پختہ کرنے کے لئے قرآن بار بار اپنے قاری کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات اور زندگی کے حیرتناک اور سبق آموز مظاہر میں غور وفکر کرے۔ مثلاً سورہ المدثر (آیات ۳۲-۳۸) میں چاند، ڈھلتی ہوئی رات اور ابھرتے ہوئے دن کو گواہ بنا کر کہا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے خالق نے مسخر کیا ہے تاکہ ''تم میں جو چاہے آگے بڑھتا جائے اور جو چاہے

پیچھے ہٹتا چلا جائے۔ ہر شخص اپنی کمائی سے بندھا ہوا ہے'' (لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ، كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ).

قرآن کے اولین قارئین کے ذہنوں پر یہ رجحان کس طرح چھایا ہوا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے موت کے وقت اپنے جانشیں حضرت عمرؓ کو جو اہم وصیتیں کیں؛ ان کا پہلا جملہ یہ تھا: "اے عمر، اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ اللہ کو ایک عمل دن میں مطلوب ہے، جسے وہ رات میں قبول نہیں کرتا اور ایک عمل رات کو مطلوب ہے؛ جسے وہ دن میں قبول نہیں کرتا؛ اسی طرح اس کی نظر میں کوئی 'نفلی عمل' قابلِ قبول نہیں جب تک کہ اس سے پہلے فرض کی ادائیگی نہ ہو چکی ہو" (لَمَّا حَضَرَ أَبَا بَكْرٍ الْمَوْتُ دَعَا عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فَقَالَ لَهُ: "اتَّقِ اللَّهَ يَا عُمَرُ، وَاعْلَمْ أَنَّ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ عَمَلًا بِالنَّهَارِ لَا يَقْبَلُهُ بِاللَّيْلِ، وَعَمَلًا بِاللَّيْلِ لَا يَقْبَلُهُ بِالنَّهَارِ، وَأَنَّهُ لَا يَقْبَلُ نَافِلَةً حَتَّى تُؤَدَّى الْفَرِيضَةُ)'' (مسند احمد)

اسی خدا شناس، خود شناس، وقت شناس اور آخرت شناس ذہنی رجحان نے کل کے حاملینِ قرآن کو انسانیت کا معمار اور قائد بنایا تھا اور اسی کے فقدان نے بعد کے حاملینِ قرآن کو انسانی قافلے کی گزرگاہ میں اڑنے والے غبار کی طرح بے وقعت اور بے اثر بنا دیا ہے۔

بروز پیر، ۴؍جولائی، ۲۹؍رمضان ۲۰۱۶ء

رمضان کب اور کس کے لئے ''مبارک'' ہے؟

سورہ البقرہ (آیت ۱۸۴) میں رمضان کے روزے کا حکم دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اسی مہینہ میں قرآن نازل کیا گیا؛ جو پوری انسانیت کے لئے ''ہدایت، نیز اس ہدایت کے واضح دلائل اور حق وباطل میں فرق کا معیار'' فراہم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''رمضان کے روزے'' اور ''قرآنی ہدایت'' میں بہت گہرا تعلق ہے۔

دراصل قرآن ایک عملی ہدایت نامہ ہے۔ اس سے رہنمائی پانے کے لئے صرف اسے زبان سے پڑھ لینا یا کان سے سن لینا کافی نہیں۔ بلکہ اس کے قاری اور سامع کے اندر حقیقت پسندی اور

سنجیدگی کا مزاج ہونا لازمی ہے؛ جس کا نام دینی اصطلاح میں 'تقویٰ' ہے۔ چنانچہ قرآن کے بالکل آغاز (سورہ البقرہ، آیت، ۲) میں ہی یہ بتادیا گیا کہ اس سے وہی لوگ ہدایت پائیں گے جو ''تقویٰ والے ہیں'' (ھدیً للمتقین)۔

اسی تقویٰ کے رجحان کو مزید ابھارنے اور تقویت پہنچانے کے لئے رمضان کے روزے فرض کئے گئے (سورہ البقرہ، آیت، ۱۸۳)۔ اس طرح گویا خدا کی آخری کتاب کے نزول کے ساتھ ساتھ اس بات کا خصوصی انتظام کیا گیا کہ اس سے استفادہ کی لازمی صفت (تقویٰ) کو ہر سال اس کے حاملین کے اندر ری چارج (Recharge) کر دیا جائے تا کہ وہ اس ربانی ہدایت نامہ سے اپنے عملی تعلق کی مسلسل شعوری تجدید کرتے رہیں اور اسے تاعمر زندہ اور بارآور رکھ سکیں۔

بنا بریں، 'رمضان' اسی وقت آپ کے لئے 'مبارک' ہے، جب اس کی سالانہ تربیت سے آپ کے اندر موجود تقویٰ کی فطری صفت، خوابیدہ حالت (Dormant State) سے نکل کر فعال اور نتیجہ خیز شکل (Active & Productive Mode) اختیار کرلے؛ تا کہ قرآنی ہدایت سے آپ کا رشتہ محض لسانی تلاوت اور سلبی سماعت (Passive Listening) تک محدود نہ رہے؛ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ آپ کے فکر وکردار کی انقلابی تشکیلِ نو کا محرک اور نگراں بن جائے۔

رمضان آپ کے لئے کتنا ''مبارک'' ثابت ہوا؟ یہ جاننے کے لئے آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے ذریعہ خدا کی رضا اور جنت کی خاطر، کتنا ضبطِ نفس (Self Discipline)؛ صبر-شکر (Patience-gratitude) اور وقت شناسی (Time-consciousness) کے رجحانات آپ کے شعور کی سطح پر ابھرے، گہرے ہوئے اور وہ آپ کی شخصیت اور روزمرہ عملی زندگی کا نمایاں حصہ بن گئے۔

آپ کا مقصدِ اعلیٰ چاہے اس دنیا کی فانی زندگی کو اپنے ''ارمانوں کی جنت'' بنانا ہو؛ یا آخرت کی لافانی دنیا میں ''خدا کی ابدی جنت'' کو پانا ہو؛ دونوں ہی کی خاطر آپ کو مذکورہ معنوں میں ایک ''متقیانہ'' زندگی گزارنی ہوگی۔ یعنی اپنے مطلوب ''مقصدِ اعلیٰ'' کے لئے یکسو ہو کر ایک طرف اپنی

ساری پونجی، سارا وقت اور ساری توانائی بلا بحث صَرف کرنی ہوگی تو دوسری طرف بہت سی جائز خواہشات اور ذاتی تقاضوں سے بلا شکایت دست بردار ہونا پڑے گا۔ آپ دین کا سودا کریں یا دنیا کا، دونوں کو پانے کی ''قیمت'' یہی ایک ہے؛ جس کو ادا کئے بغیر نہ دنیا آپ کے ہاتھ آئے گی نہ دین۔

رمضان اس وقت آپ کے لئے ''مبارک'' ہے؛ جب وہ آپ کی بصیرت کو اتنا روشن اور آپ کی ہمت کو اتنا بلند کردے کہ آپ یہ شعوری فیصلہ کرسکیں کہ جب بہر حال ''متقی'' بن کر جینا اور مرنا ہی ہے؛ تو پھر ''دنیوی جنت'' کے بجائے ''اخروی جنت'' کے لئے متقی کیوں نہ بنا جائے؟ اس قسم کے شعوری فیصلہ کے بعد آپ کی سوچ اور عملی روش خود بخود قرآن کے ربانی سانچے میں ڈھلنا شروع ہوجائے گی، آپ کو 'قربِ خداوندی' کا لطیف تجربہ ہوگا، آپ والہانہ دعاؤں کی شکل میں خدا سے اپنی محبت اور حاجت کا اظہار کریں گے اور وہ قدم قدم پر آپ کی دستگیری اور رہنمائی فرمائے گا (سورہ البقرہ، آیت، ۱۸۶)۔

خدایا، اپنے فضل وکرم سے ''رمضان المبارک'' کو حاملینِ قرآن کے لئے ہر اعتبار سے ''مبارک'' بنادے۔ (آمین!)

بروز منگل، ۵ رجولائی، ۳۰ ررمضان ۲۰۱۶ء

نفع بخش بنئے یا بےضرر بن کر جینا سیکھئے

(Be Useful to All or Harmful to None)

آج سے تیس (۳۰) سال پہلے مالیگاؤں، محلہ ہزار کھولی کی ایک مسجد میں مسلم نوجوانوں کی ذہن سازی کے لئے ایک شبینہ عربی مدرسہ چلاتا تھا۔ اس سلسلے میں غالباً بروز سنیچر، ۵ جولائی، 1986 کو عشاء بعد میں نے سورہ البقرہ کی آیت 'ھدیً للمتقین'' پر ایک درسِ قرآن دیا۔ آخر میں حسبِ معمول اس کا تحریری خلاصہ املاء کرایا؛ جس میں میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ طبعی قوانین (physical laws) کی طرح ایک یا چند جامع، معنی خیز اور فکر انگیز جملوں پر مشتمل ہو۔ میری یاد داشت کے مطابق، مذکورہ درس کی تلخیص کا پہلا جملہ یہ تھا:

''عالمِ خارجی پر ہمارا تصرف، عالمِ داخلی پر ہمارے تصرف کے متناسب ہوتا ہے''۔

میں سمجھتا ہوں، اس جملہ کی معنویت (Relevance) آج بھی باقی ہے اور میں اسے اس ''رمضان ڈائری-۲۰۱۶'' کے اختتامی خلاصے کے طور پر یہاں نقل کر رہا ہوں؛ جس کا ہر یومیہ گویا میرے گزشتہ ۳۰ سالہ مطالعے، مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں اسی اصول یا قانون کے کسی تطبیقی پہلو(Applied Aspect) کی تشریح کرتا ہے۔

اس قانون کی رو سے، زندگی نام ہے: 'اثر پذیری' اور 'اثر اندازی' کے دوطرفہ تعامل کا۔ ایک زندہ وجود (پودا، جانور، انسان وغیرہ) ہر وقت اپنے گردوپیش (ماحول) سے کوئی منفی یا مثبت اثر لیتا بھی ہے اور اس کے اوپر اپنا منفی یا مثبت اثر ڈالتا بھی ہے۔ کسی شئے اور اس کے ماحول کے مابین تاثیر اور تاثر کے اس تبادلہ کا ختم ہوجانا، اس بات کی علامت ہے کہ وہ شئے اب زندہ نہیں رہی، اس پر 'موت' واقع ہوچکی۔

انسان، استثنائی طور پر، ذی عقل و ارادہ مخلوق ہے؛ جس کی بنا پر وہ، نباتات اور دیگر جانداروں کے برعکس، اپنے گردوپیش کے ساتھ ہونے والے اس تبادلۂ تاثیر و تاثر (Exchange of Mutual Influence) کا شعوری ادراک رکھتا ہے اور بڑی حد تک اس کی مثبت اور منفی نوعیت کا آزادانہ انتخاب کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جسمانی صحت سے لےکر اخلاقی رویہ تک کے بارے میں اپنے ضمیر اور سماج اور بالآخر اپنے خالق و مالک کے سامنے جوابدہ ہے۔

مثلاً جب آپ بیمار ہوتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم نے، کھانے پینے اور رہن سہن کے بعض معمولات کی وجہ سے عارضی یا دائمی طور پر اپنی یہ داخلی صلاحیت کھودی ہے کہ اپنے خارجی ماحول کے ''صحت بخش عوامل'' سے فیض یاب ہو اور ''بیمار کُن عوامل'' کی زد سے اپنا تحفظ کر سکے۔ ایسی حالت میں خود آپ کا 'بیمار وجود' بھی اپنے ماحول کی آلودگی اور کثافت میں اضافہ کر کے اس پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ دوا، علاج اور پرہیز وغیرہ کے ذریعہ جسم کی اسی اندرونی صلاحیت (Immune System) کو بحال کیا جاتا ہے تاکہ وہ از سرِ نو اپنے ماحول کے ساتھ مثبت تاثیر و تاثر کا رشتہ استوار کرلے۔

ٹھیک یہی معاملہ آپ کی شخصیت کے روحانی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں کا ہے۔ اپنی داخلی دنیا (یعنی آپ کے خیالات، جذبات، ذہنی صلاحیتوں اور عملی روش وغیرہ) میں آپ کا تصرف (برتاؤ) جس قدر مثبت، صحت منداور ذمہ دارانہ، یا اس کے الٹا ہوگا؛ اسی قدر آپ اپنی خارجی دنیا اور اس سے ملی ہوئی چیزوں یا اس میں پیش آنے والے واقعات وحوادث سے منفی یا مثبت اثر قبول کریں گے نیز اسی تناسب سے ان کے اوپر اپنا منفی یا مثبت اثر ڈالیں گے۔ لہٰذا ''خارجی دنیا'' سے ''فائدہ'' اٹھانے یا اس کے ''ضرر'' سے بچنے کے لئے انسان کو اپنی ''داخلی دنیا'' میں صحیح اور ذمہ دارانہ برتاؤ اختیار کرنا پڑے گا۔

انسان اور مسلمان ہونے کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ آپ اپنے گردوپیش کی دنیا کے لئے نفع بخش نہیں بن سکتے تو اس کے لئے بےضرر بن کر رہیں (Be Useful to All Or Harmful to None)۔ اگر آپ اپنے ماحول پر کوئی 'مثبت اثر' نہیں ڈالتے تو اس کے منفی اثر سے خود بچئے اور اسے اپنے منفی اثرات سے بچایئے۔ بصورتِ دیگر، سخت اندیشہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کی نظر میں شاید آپ کی گنتی نہ انسانوں میں ہو اور نہ مسلمانوں میں۔۔۔!!

بروز بدھ، ۶/ جولائی، یکم شوال ۲۰۱۶ء

عید کا گلدستہ 'رمضان' (رمض ا+ن)

یہ ایک 'فکری یا معنوی گلدستہ' (A Bouquet of Thoughts) ہے؛ جس کو میں درد اور دعا میں ڈوبی ہوئی اپنی نیک خواہشات کے ساتھ، عیدالفطر (2016) کے موقع پر اپنے اہل و عیال، احباب نیز وسیع تر اسلامی اور انسانی برادری کو از راہِ تہنیت پیش کرتا ہوں۔

عام نقطۂ نظر سے مذکورہ عنوان کو برعکس طور پر یوں ہونا چاہئے تھا کہ 'عیدالفطر'، رمضان کا تحفہ یا گلدستہ ہے نہ کہ 'رمضان'، عید کا گلدستہ۔

مگر یہاں 'رمضان' سے مراد ہجری کیلنڈر کا وہ مہینہ نہیں جو ابھی ابھی گزرا اور وہ اب گیارہ

مہینوں بعد ہی لوٹ کر آئے گا۔ بلکہ یہاں 'رمضان' سے میری مراد ایک 'چار نکاتی منصوبۂ کردار سازی' (Four Point Character-building Program) ہے، جسے ایک صاحبِ ایمان کی روزمرہ زندگی کا اٹوٹ حصہ ہونا چاہئے۔ اگر آپ پوری سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ اس 'رمضان' منصوبے کو اپنالیں؛ تو مجھے یقین ہے کہ، خدا کی توفیق سے، آپ کے اندر قرآن کی مطلوب 'ربانی شخصیت' پروان چڑھے گی؛ اس کا ہمہ جہتی روحانی واخلاقی ارتقاء تاعمر بلا انقطاع جاری رہے گا؛ اور جو بالآخر 'نفسِ مطمئنہ' کے درجۂ کمال تک جا پہنچے گی؛ جس کی ابدی رہائش گاہ وہ 'پُرسکینت گھر' (''دارالسلام''، سورہ یونس، آیت، ۲۵) ہے، جو خالقِ کائنات کا لاثانی شاہ کار ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رمضان کے روزے کی فرضیت اور اس میں نزولِ قرآن کا اصل مقصد بھی بلاشبہ یہی ہے کہ ہر انسان کو ربانی سانچے میں ڈھال کر اسے 'دارالسلام' کی رہائش کے قابل بنایا جائے۔

بہ آسانی سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کے لئے اس عملی منصوبۂ کردار سازی کے چاروں کلیدی نکات کو لفظِ 'رمضان' کے حروف سے اخذ کیا گیا ہے تاکہ جب بھی آپ یہ لفظ بولیں یا سنیں تو وہ ان کی یاد دہانی بن جائے۔ وہ چار نکات حسبِ ذیل ہیں: **ر=رحمت؛ م=مغفرت؛ ض=ضمانت؛ (ا+ن)=اللہ/ اسلام کی نصرت۔**

اس منصوبہ کو موثر طور پر نافذ کرنے کا رہنما اصول یہ ہے اگر آپ ''رب کی نوازش پانے والے'' بننا چاہتے ہیں؛ تو آپ ''رب کی نوازش بانٹنے والے'' بن جائیے۔ یعنی جب آپ ماہِ رمضان کے روزہ وعبادت اور اس میں نازل ہونے والے قرآن کی تلاوت اور تعمیل سے یہ امید رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی رحمت اور مغفرت اور اس کی جنت کی ضمانت پاسکیں؛ تو آپ کو عملاً دوسروں کے لئے اسی رحمت اور مغفرت اور جنت کی ضمانت کا مظہر اور ذریعہ بن کر اس دنیا میں رہنا ہوگا۔

اس رہنما اصول کے مطابق، 'رمضان' منصوبے کے چاروں نکات کی مختصر تشریح یوں ہوگی:

1-ر۔ **رحمت** = ترمذی کی مشہور روایت ہے کہ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ, ارْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ'' (جو رحم کرنے

والے ہیں؛ انہیں پر رحمان بھی رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر مہربانی کرو؛ آسمان والا تم پر مہربان ہو گا)۔ اللہ رب العالمین کی نمایاں ترین صفت اس کی رحمت ہے، اسی طرح دینِ اسلام کی امتیازی خصوصیت اس کا دینِ رحمت ہونا ہے اور پیغمبرِ اسلام کا سب سے بڑا لقب ''رحمۃ للعالمین'' ہے۔ ظاہر ہے اگر آپ کی اپنی ذات وصفات اس رحمت کی آئینہ دار نہ ہو؛ تو گویا آپ کا کوئی بھی شعوری تعلق نہ دینِ رحمت سے ہے، نہ اس کے لانے والے رسولِ رحمت (ﷺ) سے اور نہ ہی ان کو بھیجنے والے خدائے رحمان ورحیم سے۔ پھر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ایسی حالت میں آپ دنیا یا آخرت میں کسی قسم کی رحمت کے امیدوار یا حقدار کیسے ہوسکتے ہیں؟

2-م۔ **مغفرت** = آخرت میں اپنے گناہوں کی بخشش کو یقینی بنانے اور ابدی نجات پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا میں دوسروں کی لغزشوں، کوتاہیوں بلکہ ایذاء رسانیوں کو بخش دیں (سورہ آل عمران، آیت، ۱۳۴؛ سورہ الجاثیہ، آیت، ۱۴-۱۵؛ سورہ الشوریٰ، آیت، ۴۳، وغیرہ)۔ قرآن کے علاوہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی حدیثوں میں بار بار اس کی ترغیب دی گئی ہے اور آپ (ﷺ) کی پوری زندگی اس کا بہترین عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔

3-ض۔ **ضمانت** = یعنی ''جہنم سے امان اور جنت میں داخلے کی ضمانت''۔ اس کے لئے آپ کو اس زمین پر دوسروں کا بے لوث خیر خواہ اور ان کے لئے بالکل بے ضرر بن کر جینا ہوگا۔ ''مومن اور مسلم'' کے لغوی معنی ہیں: ''امن اور سلامتی دینے والا''۔ اسی بنا پر احادیث میں بڑی کثرت اور شدت سے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ شخص صاحبِ ایمان اور صاحبِ اسلام نہیں ہوسکتا جس کی شرانگیزی یا فتنہ پردازی سے دوسرے لوگ امن وامان میں نہیں۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں آپ (ﷺ) نے خدا کی قسم کھا کر فرمایا کہ جنت میں داخلے کے لئے ایمان شرطِ لازم ہے اور ایمان کے لئے باہمی محبت شرطِ لازم اور باہمی محبت کی شرطِ لازم ہے: آپس میں امن اور سلامتی کی فضا قائم کرنا۔

4-(ا+ن)۔ **اللہ/ اسلام کی نصرت** = اللہ کی نصرت کا مطلب اس کے دین یعنی اسلام کی نصرت بذریعۂ دعوت ہے اور اس کی خاطر حسبِ ضرورت اپنے جان و مال اور وقت کی قربانی دینا ہے۔ ایسا

کرنے والوں کو قرآن میں ''انصاراللہ'' (خدا کے مددگار) کہا گیا ہے (سورہ الصّف، آیت، 14) اور
خدا نے ان کی مدد کا پختہ وعدہ کیا ہے (سورہ محمد، آیت، 7) یہ نکتہ ''رمضان'' منصوبے کا واحد خارجی
نشانہ ہے جس کا نفاذ داخلی استعداد اور خارجی حالات کی حقیقت پسندانہ رعایت سے انفرادی اور اجتماعی
دونوں سطح پر کیا جائے گا؛ جبکہ اوّل الذکر تین نکات اس کے داخلی نشانے ہیں جو ہر صاحبِ ایمان سے
ہر جگہ اور ہر حالت میں فرداً فرداً مطلوب ہیں۔

رمضان ڈائری 2017

ربانیت کا نقطہ آغاز

تمام گروپ ممبران کو رمضان کی خصوصی مبارکباد۔

متعدد احباب کی گزارش پر، سال گزشتہ کی طرح، اس سال بھی ''رمضان ڈائری'' لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے اللہ کی توفیق سے یہ کوشش مکمل اور مفید ہوگی۔

رمضان کے روزے نیز، دیگر اسلامی عبادات اور جملہ شرعی احکام کا مقصد صرف ایک ہے: ہر انسان کے فکر وشعور اور کردار وعمل کو ربانی سانچہ میں ڈھالنا، جیسا کہ سورہ آل عمران، آیت 79 میں کہا گیا ہے: ''کونوا ربانیین'' ''رب والے بن جاؤ، یعنی ''خود پرستی'' کے بجائے ''خدا پرستی'' کو اپنی اصل شناخت اور اپنی زندگی کا دائمی مرکز ومحور بناؤ۔

ربانی انسان بننے کا نقطۂ آغاز (Starting Point) سچی توبہ (توبۂ نصوح، سورہ التحریم، آیت 8) ہے۔ بلکہ میں اسے کسی بھی عبادت یا نیک کام کی افادیت اور قبولیت کے لئے شرطِ لازم سمجھتا ہوں۔ کمپیوٹر کی زبان میں توبہ ایک قسم کا ''اینٹی وائرس'' میکانزم ہے جو آپ کی ایمانی، اخلاقی اور روحانی سلامتی وترقی کو نقصان پہنچانے والے تمام داخلی اور خارجی عناصر کا مقابلہ کرتا ہے اور آپ کو مسلسل صراط مستقیم پر جمے رہنے میں مدد دیتا ہے۔

لہذا تمام ممبران سے میری اولین اور اہم ترین گزارش یہ ہے کہ وہ ماہِ رمضان بلکہ اس کی ہر صبح وشام کا استقبال سچی شعوری توبہ سے کریں، نیز اپنے اہل وعیال اور احباب کو بھی اسی کی تلقین کریں، قرآن کی رو سے اہلِ ایمان کو فلاح وکامیابی، توبہ ہی کے راستے مل سکتی ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ '' (سورہ النور، آیت ۳۱)'' اور مومنو! سب خدا کے آگے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ''

روزہ اور ''وقت شناسی'' (۱/۲)

تمام اسلامی عبادتوں کا ''وقت کی تنظیم'' یعنی اس کے سنجیدہ اور بامقصد استعمال سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان عبادتوں کو شعوری طور پر ادا کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ ایمان ''وقت'' کے معاملہ میں انتہائی حساس ہو جاتا ہے۔ وہ لغو تفریحات اور بے فائدہ کاموں میں وقت کے ضیاع کو خودکشی کے مترادف سمجھتا ہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے فلکیات اور دیگر علومِ طبعی میں جو پیش رفت اور ترقی حاصل کی، میں سمجھتا ہوں اس کا ایک بنیادی محرک، وقت کی نسبت سے ان کا وہ ذمہ دارانہ ذہنی رجحان اور منصوبہ بند عملی رویہ تھا، جو اسلامی عبادات کی شعوری ادائیگی سے پیدا ہوتا ہے۔

مثلا روزانہ کی پانچ فرض نمازوں کے مقررہ اوقات، ہمارے نظامِ شمسی کے پانچ حیرت ناک انقلابی مراحل سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح زکوۃ کے حساب کتاب اور حج کے مخصوص دنوں کا تعین کرنے کے لئے سال بھر چاند کی گردش پر نظر اور اس پر منحصر قمری مہینوں کا شمار رکھنا ضروری ہے۔ جبکہ رمضان کے مہینے میں روزہ کے آغاز اور خاتمہ کے وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا آخری حد تک نازک بن جاتا ہے۔ وہ ایک اعتبار سے گویا ''زندگی اور موت'' کا فیصلہ کرنے کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔ عبادات کی یہ ترتیب بے حد حکیمانہ ہے، ان پر غور کرنے سے بیک وقت ربانی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے، اور کائنات اور زندگی کے گہرے اسرار کا سُراغ ملتا ہے۔

ترقی یافتہ سائنسی اور صنعتی وسائل (گھڑی، کیلنڈر، سیٹلائٹ وغیرہ) نے ''وقت کی پیمائش'' کو بہت آسان بنا دیا ہے جن کے ذریعہ ہم روزہ اور دیگر عبادتوں کے مقررہ اوقات اور ایام کا پیشگی تعین کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ ''وقت پیمائی'' وہ چیز نہیں جسے میں ''وقت شناسی'' کہتا ہوں، جو میری نظر میں انسانی شعور کی پختگی کی اہم ترین علامت ہے اور جس کے بغیر انسان نہ خالق کی سچی معرفت حاصل کر سکتا ہے، نہ ہی مخلوق کی سچی خدمت کے قابل بن سکتا ہے۔

روزہ اور ''وقت شناسی'' (۲/۲)

''وقت شناسی'' محض یہ جاننے کا نام نہیں کہ اس وقت دن یا رات کے کیا بجے ہیں، یا آج ھجری یا عیسوی کیلنڈر کی کون سی تاریخ ہے یا یہ تاریخ پچھلے سال کس دن تھی یا اگلے سال وہ کس دن پڑے گی، وغیرہ۔ اس قسم کی معلومات آج کے دور میں انسان سے زیادہ سرعت اور قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر اور دوسرے مشینی آلات فراہم کر سکتے ہیں۔

بحیثیت انسان، اور بالخصوص بحیثیت ایک صاحبِ ایمان کے آپ سے جو ''وقت شناسی Time-consciousness'' مطلوب ہے وہ اس حقیقت کا شعوری ادراک کرنا ہے کہ جس طرح ہر ''کام'' کا ایک ''مقرر وقت'' ہوتا ہے، اسی طرح ہر ''وقت'' کا ایک ''مقرر کام'' ہے۔ بنا بریں، آپ کی ذمہ داری صرف یہی نہیں کہ آپ ہر ''کام'' کو اس کے مقرر وقت پر انجام دیں؛ بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی جانیں کہ ہر وقت، کسی بھی گزرتے ہوئے وقت کا ''مقرر کام'' کیا ہو سکتا ہے جسے حسبِ استطاعت آپ کو انجام دینا ہے۔ کیونکہ آپ کی دنیوی کامیابی اور اخروی نجات وسعادت کا دار و مدار ''وقت'' کے انہیں دوطرفہ تقاضوں کی معیاری یا کم از کم ممکنہ تکمیل پر ہے۔

میرے علم میں ''وقت شناسی'' کے اس عارفانہ تصور کی واحد بہترین تعریف حضرت ابو بکر الصدیقؓ کی وہ وصیت ہے جو انہوں نے اپنی موت کے وقت حضرت عمرؓ کو ان الفاظ میں کی تھی: ''اللہ کا ایک حق رات میں مطلوب ہے جو دن میں ادا کیا جائے تو اسے قبول نہیں ہوگا اور اس کا ایک حق دن کے وقت مطلوب ہے جس کی ادائیگی کو وہ رات میں قبول نہیں کرے گا۔ نیز اللہ کوئی نفل عبادت قبول نہیں کرتا جب تک کہ فرض ادا نہ ہو جائے۔۔۔۔ جو شخص رمضان کے مہینے میں روزہ نہ رکھے اور بقیہ تمام مہینوں میں تا عمر روزہ دار بنا رہے تو اس کی یہ روزہ داری قابلِ قبول نہ ہوگی''۔ (العقد الفرید، کنز العمال)

رمضان کے روزہ کی فرضیت کا مقصد اہلِ ایمان کے اندر ''تقویٰ'' یعنی خداشناسی اور خداترسی

کی زندہ اسپرٹ پیدا کرنا ہے (البقرۃ، آیت 183)۔ یہ ''تقویٰ اسپرٹ'' جب انسان کے ذہن وشعور اور مزاج میں سما جاتی ہے تو اس کا عملی اظہار سب سے زیادہ اسی کیفیت میں ہوتا ہے جسے میں نے عارفانہ ''وقت شناسی'' کا نام دیا ہے اور انبیاء ورسل کے بعد اس کا مثالی نمونہ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے کردار میں ملتا ہے۔ ماہِ رمضان کا مخصوص نظام الاوقات ''وقت شناسی'' کے اس مزاج کو پروان چڑھانے کے لئے بہترین تربیتی کورس ہے بشرطیکہ اس کے ہر تقاضے کو نہایت ہوش مندی کے ساتھ پورا کیا جائے۔

روزے سے تقویٰ اسپرٹ اور تقویٰ اسپرٹ سے ''وقت شناسی'' کا یہ ذہنی رجحان اور عملی مزاج جس فرد یا خاندان یا قوم میں پیدا ہو جائے، اس کی زندگی حسنِ عمل اور کسبِ کمال کے لئے ایک سراپا اضطراب اور تگ ودو بن جاتی ہے۔ بظاہر سب کچھ کر کے بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گویا انہوں نے کچھ نہیں کیا، یا شاید جو کچھ کیا وہ سب وقت کے ''نوافل'' تھے، اور جو وقت کے اصل ''فرائض'' تھے انھیں وہ بروقت اور کما حقہ انجام نہ دے سکے۔ یہ احساس ایک وقت شناس مومن کو ڈر اور امید کے درمیان مسلسل توبہ واستغفار میں غرق رکھتا ہے۔

بروز منگل ۳۰ رمئی، ۴ر رمضان ۲۰۱۷ء

روزہ: برتر اسلامی کردار کی شناخت

روزہ کے تعلق سے ایک مشہور روایت صحیح البخاری وغیرہ میں اس طرح آئی ہے: روزہ ایک ڈھال ہے، لہذا روزہ دار نہ تو بیہودہ ہنسی مذاق کرے، نہ کسی قسم کی بدسلوکی کرے اور اگر کوئی شخص اس سے جھگڑنے لگے یا اس کے ساتھ گالی گلوچ کرے تو وہ کہے کہ ''میں ایک روزہ دار ہوں''۔

ظاہر ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر آپ روزہ سے نہ ہوں تو پھر دوسروں کے ساتھ بیہودہ مذاق یا بدسلوکی اور لڑائی جھگڑا کرنے کے لئے آپ بالکل آزاد ہیں۔

اسلامی معیارِ اخلاق کی رو سے قول وفعل کی ہر برائی ہر حالت میں ناجائز ہے، حتی کہ ایک سچے مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ برائی کے ردِعمل میں بھی بھلائی کرے یا کم از کم اسی درجہ کی جوابی برائی نہ کرے جو انتقامی کارروائی کے طور پر ایک حد تک جائز بھی ہے (سورہ النحل، آیت 126،

سورہ فصلت آیت 34)

برائی سے ہمیشہ بچنا اور بھلائی پر ہر حال میں جمے رہنا، یہ وہ برتر اخلاقی صفت ہے جو، قرآن وحدیث کی روسے، ایک مومن اور غیر مومن کے درمیان فرق کرتی ہے (سورہ الجاثیہ، آیت،14)۔

درحقیقت روزہ سمیت تمام اسلامی عبادتوں کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ مومنانہ کردار کے اس امتیازی وصف کو زیادہ سے زیادہ پختہ اور پائیدار بنایا جائے۔ مثلاً قرآن میں حج کے احکام بتاتے ہوئے یہ ہدایت دی گئی ہے: ''۔۔۔جو حج کا ارادہ کرلے تو پھر وہ بے جا ہنسی مذاق، بدکلامی اور بحث وتکرار سے بچے'' (سورہ البقرۃ آیت 197)۔ نماز کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فحشاء اور منکر (ہر قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی) سے روکتی ہے (سورہ العنکبوت آیت 45) اسی طرح صدقہ وخیرات کرتے ہوئے اہل ایمان کے دلوں پر اپنی سخاوت کا فخر و ناز نہیں بلکہ خدا کے سامنے حاضری کا ڈر چھایا رہتا ہے۔ (سورہ المومنون، آیت 60)

اس برتر اخلاقی اصول کو غیر مشروط طور پر عملاً وہی شخص اپنا سکتا ہے جس کے اندر مکمل ضبطِ نفس (Total Self-control) کی صلاحیت ہو اور یہ صلاحیت، حقیقی معنوں میں، صرف خدا پر زندہ ایمان اور اس کے سامنے جوابدہی کے شعوری استحضار سے پیدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے روزہ، دیگر عبادتوں کے مقابلہ میں، سب سے زیادہ نمایاں طور پر مکمل ضبطِ نفس کی تربیت دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے خارجی اور داخلی ہر پہلو سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ آپ خدا پر اپنے ایمان کو مسلسل زندہ رکھیں اور اس حقیقت سے کبھی غافل نہ ہوں کہ آپ بالآخر رب العالمین کے آگے جوابدہ (Accountable) ہیں، جس کے پاس آپ کے ذہنی ارادوں اور پوشیدہ جذبات وخیالات سے لے کر چھوٹے بڑے تمام عملی حرکات وسکنات تک کا بے کم وکاست ریکارڈ موجود ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ روزہ برتر اسلامی کردار کی شناخت ہے۔

بروز بدھ، ۳۱رمئی، ۵ررمضان ۲۰۱۷ء

روزہ: ''حساسیت کے توازن'' کی بحالی کا ذریعہ (۱/۲)

انسان کی کامیابی اور ناکامیابی، خوشحالی اور بدحالی دونوں کا بہت گہرا تعلق اس

کی ''حساسیت'' (Sensitivity) اور اس کی بے حسی (Insensitivity) سے ہے۔ اگر آپ وہاں بیش حساس (Over-sensitive) بن جائیں، جہاں آپ کو بے حس یا کم حساس (Less-sensitive or Insensitive) ہونا چاہئے؛ یا آپ ایسے معاملہ میں بے حسی برتیں، جس میں آپ کو بیش حساسیت سے کام لینا چاہئے، تو بالآخر آپ کی زندگی مختلف پہلوؤں سے ناکامی ونامرادی اور بدحالی کی ایک عبرتناک داستان اور دردناک تصویر بن کر رہ جائے گی۔

اس دردناک انجام سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر اپنی حساسیت کے توازن کو بحال کرنے اور بحال رکھنے (Restoration cum Maintenance of Sensitivity Equilibrium) کی سنجیدہ کوشش کرے۔ رمضان کا روزہ اپنی ظاہری شکل اور اندرونی اسپرٹ دونوں اعتبار سے انسان کی حساسیت کے بگڑے ہوئے توازن کی بحالی اور برقراری کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

جب ایک شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ، صرف اپنے خالق اور رازق کے حکم کی مخلصانہ اطاعت کے لئے ایک طرف کھانا پینا اور دیگر ممنوعہ چیزوں کو ایک خاص مدت تک چھوڑ دیتا ہے، دوسری طرف اس دوران وہ اپنی زبان، اپنے منفی خیالات، اپنے شہوانی جذبات اور جسمانی حرکات وسکنات پر بالا رادہ کنٹرول رکھتا ہے اور تیسری طرف وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت خدا کی عبادت، کلامِ خداوندی کی سنجیدہ تلاوت وسماعت اور خدا کے محتاج بندوں کی غمگساری اور اعانت میں گزارتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی سوچ میں گہری انقلابی تبدیلی پیدا ہو، اس کی زندگی کی ترجیحات اور اس کا معیارِ قدر بدل جائے، وہ حیات اور کائنات کی ربانی اسکیم کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے لگے اور اپنے فکر وعمل کو اس سے مکمل اور غیر مشروط طور پر ہم آہنگ کرلے۔

جو انسان اس طرح اپنے خالق و مالک کی کائناتی اسکیم سے ہم آہنگ ہو جائے وہ یقیناً حساسیت کے عدم توازن (Imbalance of Sensitivity) اور اس کے مہلک نتائج سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا اور وہ فلاح وسعادت کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی سے چلتا رہے گا۔

روزہ: ''حساسیت کے توازن'' کی بحالی کا ذریعہ (۲/۲)

اکثر انسان اپنی عادات اور معمولات اور خاندانی وسماجی رسوم وروایات کے خول میں بند ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ خول ان کے لئے ایک قسم کا ''خطۂ راحت Comfort Zone'' بن جاتا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک عادتوں اور روایتوں کے اس مانوس خول میں رہتے رہتے بیشتر انسان اسی کو صحیح اور غلط کا پیمانہ اور رد وقبول کا معیار بنا لیتے ہیں۔ یعنی جس چیز کے وہ عادی ہیں وہ زندگی کی اولین ترجیح (Top Priority of Life) کا درجہ رکھتی ہے اور ان کے گھر اور معاشرے کی روزمرہ سرگرمیاں جس طریقے اور جس رخ پر چل رہی ہیں وہ بالکل درست ہیں، ان پر نظرِ ثانی کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس رجحان کے نتیجہ میں ان کا توازنِ حساسیت (Sensitivity Equilibrium) بگڑ جاتا ہے۔ وہ ایک فرسودہ روایت یا غلط عادت کو درست مان کر اس کے بارے میں بیش حساس (Hyper-sensitive) بن جاتے ہیں اور اس کی پُرجوش حمایت کرتے ہیں مگر اس کے بالمقابل ایک واقعی درست بات کو بے حسی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں خواہ اس کے حق میں کتنے ہی ٹھوس عقلی ونقلی دلائل کا انبار لگا دیا جائے۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ قبولِ حق اور اصلاح پذیری کی استعداد کھو دیتے ہیں۔

رمضان کا روزہ اپنے مخصوص نظام الاوقات اور دیگر عملی پابندیوں کی بنا پر گویا ایک حفاظتی ڈھال ہے جو اہلِ ایمان کو حساسیت کے عدمِ توازن کی اس تباہ کن بیماری سے بچاتا ہے۔ ہر سال پورے ایک مہینے کے لئے وہ انھیں عادتوں اور روایتوں کے مانوس مگر مہلک خطۂ راحت سے باہر نکال کر ایک غیر معمولی پُرمشقت روحانی سرگرمی میں مشغول رکھتا ہے۔ اس دوران خاص طور پر قرآن سے ان کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے، جو انسانیت کی ہدایت کے لئے روشن دلائل پر مبنی صحیح اور غلط کا ابدی معیار (الفرقان) بنا کر اسی مہینے میں اتارا گیا۔ جس کو پڑھنے، سننے اور سمجھنے کی سنجیدہ کوشش اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ ایک مومن فرد یا گروہ کبھی راہِ راست سے بھٹکنے نہ پائے۔ وہ ''نعمتوں'' سے زیادہ ''مُنعِم'' کا ذاکر وشاکر بنے، وہ مخلوقات کے آئینے میں خالق کے جلال وکمال کی تجلیاں دیکھے، وہ اپنے حق سے زیادہ اپنی ذمہ

داری پر نظر رکھے اور دنیا کی ظاہری اور وقتی رونقوں سے زیادہ وہ آخرت کی لافانی مسرتوں کا طلبگار بنے۔

ایمان اور احتساب

رمضان کے صیام (روزے) اور قیام (تراویح، تہجد وغیرہ) کے سلسلے میں مشہور حدیث ہے کہ جو شخص ان کو ''ایمان'' اور ''احتساب'' کے ساتھ ادا کرے گا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں۔ یہی الفاظ لیلۃ القدر کی عبادت کے ذیل میں بھی آئے ہیں۔ گویا ماہِ رمضان وہ سنہری موقع (Golden Opportunity) ہے جبکہ آپ اپنی سابقہ لغزشوں، خطاؤں اور کوتاہیوں کے منفی اور مضر اثرات سے پاک صاف ہو کر ایک نئی بہتر زندگی کا آغاز کر سکیں، ایسی زندگی جو قرآنی ہدایت کے روشن نشانات اور حق وباطل کے ابدی معیار (الفرقان) پر قائم ہو، جس کا مقصد خدا کی بڑائی اور شکر گزاری کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرنا اور خلقِ خدا کو خدا کے قریب لانا ہو۔

تاہم حدیث کے مطابق اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانے کا دار و مدار ''ایمان اور احتساب'' پر ہے۔ اس لئے گہرائی سے ان کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ تمام شارحینِ حدیث اس پر متفق ہیں کہ یہاں ''ایمان'' سے مراد اس یقین کو دل ودماغ میں از سرِ نو زندہ اور پختہ کرنا ہے کہ روزہ خدا کی طرف سے فرض ہے جسے پوری مستعدی اور خوشدلی کے ساتھ ایسے ہی ادا کرنا ہے جیسے ایک وفادار غلام اپنے مالک کا حکم بجا لاتا ہے۔ جبکہ ''احتساب'' سے مراد بیک وقت رمضان کے صیام وقیام پر خدا کے خصوصی اجر وانعام کو پانے کا سنجیدہ شوق وولولہ اور کسی دانستہ یا نادانستہ سبب کی بنا پر اس سے محروم ہو جانے کا خوف واندیشہ ہے۔

یہ ''ایمان'' اور ''احتساب'' کا اصطلاحی مفہوم ہوا۔ البتہ ہر لفظ کی طرح ان کا ایک تطبیقی مفہوم (Applied Implication) ہے اور وہی یہاں مقصود ہے۔ وہ یہ کہ رمضان کے فیوض وبرکات سے استفادہ کے لئے اہلِ ایمان کو شعور اور فکر وعمل کی سطح پر ویسے ہی تیار (Prepared) اور یکسو (Dedicated) ہونا چاہئے؛ جیسے ایک ہوشمند تاجر کسی تجارتی سیزن سے منافع کمانے کے لئے

ہوتا ہے۔ وہ مارکیٹ کی ڈیمانڈ کا پیشگی اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا ہے اور اسی لحاظ سے ضروری سرمائے اور مطلوب اشیاء کی بروقت سپلائی کے انتظامات پوری تندہی کے ساتھ کرتا ہے اور بالآخر وہ ایک سیزن میں اتنا منافع کما لیتا ہے کہ پچھلے نقصانات کی بھرپائی کرتے ہوئے آئندہ مزید مستحکم کاروبار کا منصوبہ بھی بنالے۔ مادی دنیا میں ایک ہوشمند تاجر کا یہ ذہنی رجحان اور عملی رویہ جب رمضان کے صیام و قیام اور دوسرے دینی اور روحانی اعمال کے میدان میں اپنایا جائے تو اسی کا نام ایمان اور احتساب ہے، جن کے بغیر یہ اعمال بے جان اور بے سود؛ جبکہ ان کی شمولیت سے یہی اعمال رحمت اور مغفرت اور ابدی نجات کے زینے بن جاتے ہیں۔

بروز سنیچر، ۳؍جون، ۸؍رمضان ۲۰۱۷ء

تلاوت اور تدبرِ قرآن (۱/۲)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہو۔ اس مناسبت سے، ماہِ رمضان میں فطری طور پر قرآن کے پڑھنے اور سننے اور حسبِ امکان اسے سمجھنے کی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال اس مہینے میں فرشتۂ وحی جبریل علیہ السلام کے ساتھ اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا اِعادہ اور مذاکرہ کیا کرتے تھے۔

لغوی اعتبار سے قرآن کے معنی ہی ایسے کلام کے ہیں جس کو بار بار مسلسل پڑھا جائے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ سنہ 610 عیسوی کے ماہِ رمضان کی جس شب کو غارِ حراء میں آکر خدا کے فرشتے نے رسول اللہ (ﷺ) سے کہا کہ: ''اقرأ'' (پڑھ)، تب سے یہ کلامِ الٰہی بلا انقطاع (Non-Stop) کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے کسی نہ کسی خطہ میں پڑھا جارہا ہے۔ سب سے پہلے خود رسول اللہ (ﷺ) اسے ہر وقت پڑھتے رہتے، پھر یہی عمل آپ پر ایمان لانے والے کرنے لگے، پھر وہ روزانہ پنج وقتہ نماز کا ایک لازمی حصہ بن گیا اور بتدریج نماز کے اندر اور باہر قرآن کو پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا یہ معمول آج ایک ارب سے زیادہ مسلم آبادی میں اس طرح رائج ہے کہ عالمی ٹائم زون (Global Time Zone) کے نقشے پر دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہیں، جہاں وہ

جاری نہ ہو۔ (میری ہدایت پر میرے کچھ طلبہ نے 2010 میں اس موضوع پر ایک ریسرچ پروجکٹ تیار کیا تھا، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں)۔

اس سلسلے میں گزشتہ صدی کے دوران برِصغیر کی بعض دینی تنظیموں کی طرف سے ایک قابلِ قدر کوشش یہ ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو ''قرآن'' کے الفاظ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے معانی سمجھنے اور ان پر تدبر کرنے کی ترغیب دیں۔ اس مقصد کے لئے جگہ جگہ درسِ قرآن یا قرآن فہمی کی کلاسوں کا اجراء کریں، مختلف مقامی اور عالمی زبانوں میں قرآن کے ترجمے اور تفاسیر چھاپ کر مفت یا رعایتی قیمت پر تقسیم کریں۔ آگے چل کر مسلم ممالک خصوصاً سعودی عرب کی سربراہی میں مترجَم قرآن کی اشاعت اور تقسیم کا یہ کام عالمی پیمانہ پر پھیل گیا۔ موجودہ صدی میں متنِ قرآن اور اس کے ترجموں کے ڈیجیٹل نسخے انٹرنیٹ اور موبائل فون کے ذریعہ امکانی طور پر اب کرۂ ارض کے ہر باشندے کی دسترس میں ہیں۔ شاید یہ حفاظتِ قرآن کے خدائی وعدہ (سورہ الحجر، آیت ۹) کی آخری تکمیل ہے۔

اس ضمن میں بعض پُرجوش افراد قرآن کے فہم و تدبر کی اہمیت بتاتے ہوئے اس کی لفظی تلاوت کو بے فائدہ کہہ کر اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ مگر یہ رویہ درست نہیں۔ قرآن کا عربی متن ہی اصل ربانی کلام ہے جو بذریعہ وحی نازل کیا گیا، اور اس کو بعینہ پڑھنا، سننا اور یاد کرنا ایک مستقل نیکی ہے۔ چاہے پڑھنے والا عربی زبان و بیان سے ناواقفیت کی بنا پر اسے روانی سے نہ پڑھ سکے اور نہ ہی اس کے مطالب کو سمجھ پائے۔ اس لفظی تلاوت کا ثواب پانے کی واحد شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا صدقِ دل سے اس کو رب العالمین کا آخری اور لاریب کلام مانتا ہو۔

بروز اتوار، ۴؍جون، ۹؍رمضان ۲۰۱۷ء

تلاوت اور تدبرِ قرآن (۲/۲)

متنِ قرآن کی لفظی تلاوت کے باعثِ اجر ہونے کی دلیل کے لئے ابن مسعودؓ کی وہ حدیث کافی ہے جسے ترمذی نے روایت کیا ہے جس میں صراحۃً قرآن کا ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیوں کے اجر کی بشارت آئی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ (ﷺ) نے بطورِ مثال تین حرف

(الم) کا ذکر گیا ہے، جو حروفِ مقطعات میں سے ہیں اور جمہور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان سے مراد کیا ہے اس کا قطعی علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کی مجرد تلاوت، بشرطِ ایمان، موجبِ اجر ہے، خواہ کسی وجہ سے پڑھنے والا اس کے معانی کو نہ سمجھ سکے۔ حتیٰ کہ اگر ایک صاحبِ ایمان، پوری کوشش کے باوجود، الفاظِ قرآن کو دشواری کے ساتھ اٹک اٹک کر پڑھے، تو بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث میں اسے دہرے اجر کا مستحق بتایا گیا ہے۔

البتہ قرآن میں تدبر اور دعوت واصلاح کے لئے اس کی تفہیم ایک مستقل دینی فریضہ ہے۔ تاہم قرآن کا ترجمہ وتفسیر، خواہ وہ کسی زبان میں کیا جائے، وہ متنِ قرآن کا بدل نہیں۔ وہ اس کے معانی کو سمجھنے اور سمجھانے کی انسانی کوشش ہے، وہ درست ہو تب بھی ''وحی الٰہی'' کا درجہ ہرگز نہیں رکھتی۔ اس عمل کو کرنے والا اپنے اجتہاد اور اخلاص کے بقدر یقیناً عنداللہ ماجور اور مشکور ہوگا۔

مزید یہ کہ تدبرِ قرآن محض اس کے الفاظ کے مطالب ومعانی کو سمجھنے کی خشک عقلی وعلمی کاوش کا نام نہیں؛ بلکہ وہ اپنی عقل اور علم اور ارادہ واختیار کو قرآن کے تابع بنانے کا نام ہے۔ تدبر کا حقیقی مقصد ہے، قرآن میں غور وفکر کرکے اس سے نصیحت لینا (سورۃ ص، آیت ،29) اور پھر اس کے بہتر پہلو کی عملی پیروی کرنا (سورۃ الزمر، آیت ،18)۔ ایسا تدبرِ قرآن جس کے نتیجہ میں ''تذکر''، یعنی نصیحت پذیری اور ''اتباع''، یعنی اس کی عملی پیروی کا دوگونہ مقصد حاصل نہ ہو، وہ ایک قسم کا ذہنی تعیش (Intellectual Indulgence) ہے؛ اور سخت اندیشہ ہے کہ اس کو کرنے والا عنداللہ عذاب کا مستحق ٹھہرایا جائے نہ کہ ثواب کا۔ اسی بنا پر مسلم کی ایک روایت میں یہ تنبیہ ہے کہ قرآن تمہارے حق میں خدا کی حجت ہے یا تمہارے خلاف (القرآن حجۃ لک اوعلیک)۔

آسمانی کتابوں اور صحیفوں کی تاریخ میں، قرآن کی تلاوت اور حفظ کی روایت جو نزولِ قرآن کے اوّل دن سے قائم ہوئی اور بلا انقطاع آج بھی جاری ہے؛ ایک انتہائی انوکھا استثناء ہے، جس کے ذریعہ، پرنٹنگ پریس، ٹیپ ریکارڈر اور الیکٹرانک میڈیا کے انقلاب سے پہلے یہ ''معجزہ''، ممکن ہوا کہ قرآن کے الفاظ کسی بھی قسم کی تبدیلی کے بغیر اپنی اصل شکل میں محفوظ رہیں اور آنے والی عرب اور غیر

عرب تمام نسلیں ہر زمانے میں اس کی صوتی قرات ٹھیک اسی طرح کرتی رہیں جس طرح اس کے لانے والے نے خود کرکے بتایا تھا اور بتوفیق الٰہی، دعوت واصلاح کی غرض سے اس کو سمجھنے سمجھانے کی ممکنہ کوشش بھی جاری رکھیں۔

بروز پیر، ۵رجون، ۱۰ررمضان ۲۰۱۷ء

مقبول روزے کی علامت

رمضان کے روزے کی فضیلت میں غالباً سب سے زیادہ مشہور وہ حدیثِ قدسی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے ہر نیک عمل کا انعام دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا کر دیا جاتا ہے،''۔۔۔سوائے روزے کے، کیونکہ وہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کا اجر دوں گا؛ وہ میری خاطر اپنی خواہش اور اپنا کھانا تک چھوڑ دیتا ہے'' (''...إِلَّا الصَّوْمَ ، فَإِنَّهُ لِي ، وَأَنَا أَجْزِي بِهِ ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي''، صحیح مسلم)

اس حدیث کی تشریح میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تاہم آج اس پر غور کرتے ہوئے ایک بالکل ہی نیا اور لطیف پہلو یہ سامنے آیا کہ اس میں روزے کی فضیلت کے ضمن میں گویا اہلِ ایمان کو یہ بتایا گیا ہے کہ روزے کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ روزہ کا عمل خود روزہ دار کو ایسا بنا دے کہ وہ اپنی اندرونی سوچ اور خارجی سرگرمیوں سمیت حقیقی اور مکمل طور پر سراپا ''خدا کے لئے'' ہو جائے۔ اور جب کوئی اس طرح سراپا ''خدا کے لئے'' وقف ہو جائے تو وہ خدا جو اکرام الاکرمین ہے بلاشبہ اس کا اکرام وانعام بھی بذاتِ خود اور بے حساب شکل میں عطا کرے گا۔

یوں تو کوئی بھی نیک عمل جو خالصۃً اللہ کے لئے نہ کیا جائے، وہ اللہ کی نظر میں بے وقعت بلکہ قابلِ مؤاخذہ ہے۔ البتہ روزہ اپنے معمول شکن نظام الاوقات (Routine-breaking Schedule) اور خلافِ نفس پابندیوں کی وجہ سے استثنائی طور ہر ایک ایسا فریضہ ہے، جسے انجام دینے کے لئے انسان کو خدا کے ہمہ وقت حاضر وناظر ہونے پر یقین اور اس کے سامنے جوابدہی کے احساس کو ہر لمحہ اپنے قلب ودماغ میں زندہ اور فعال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ کوئی بھی شخص صحیح معنوں میں

روزہ کا حق ادا نہیں کرسکتا، بلکہ ایک حدیث کے مطابق اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کو رمضان کے صیام وقیام سے سوائے بھوک، پیاس، تکان اور تلخ مزاجی کے اور کچھ نہیں ملتا۔

روزہ، ایک اعتبار سے قرآنی تصورِ حیات: "إنا لله وإنا إليه راجعون" (یعنی ہم اللہ کے لئے ہیں اور بالآخر ہمیں اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے) کی جیتی جاگتی تصویر بن جانے کا نام ہے۔ اس تصور کے زیرِ اثر آپ کے فکر وکردار کے ہر پہلو میں ''ربانیت'' کی جھلک پیدا ہوگی۔ اور آپ کی زندگی رمضان اور غیر رمضان دونوں میں ایک قسم کی ''روزہ دارانہ زندگی'' بن جائے گی۔ بالفاظ دیگر روزے کی قبولیت کی پہچان یہ ہے کہ آپ کی زبانِ حال یہ کہنے لگے کہ ''خدایا میں اور میرا سب کچھ صرف تیرا اور تیرے لئے ہے''؛ اور اسی کی تصدیق کرتے ہوئے رب العالمین اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ: ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا انعام دوں گا''

بروز منگل، ۶ رجون، ۱۱ ررمضان ۲۰۱۷ء

دعاء کی قیمت

''وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ'' (البقرہ، آیت، 186)

''اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں بلا شبہ قریب ہوں؛ دعاء کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعاء کرے۔ لہذا ان کو چاہیئے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت یاب ہوں'' (سورۃ البقرہ، آیت، 186)

یہ آیت رمضان کے روزے سے متعلق آیات کے درمیان آئی ہے۔ جو اس بات کا اشارہ ہے کہ روزہ کی حالت میں دعاء کی اہمیت اور اس کی قبولیت کا امکان عام دنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ متعدد احادیث میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے۔

تاہم اس آیت میں دراصل یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعاء جہاں ایک مومن کے لئے خدا سے ہمکلام ہونے اور اس سے اپنی حاجت روائی کی درخواست کا ذریعہ ہے؛ وہیں وہ خدا کے ساتھ ایک قسم کا عہد

(Pledge) ہے جو گویا دعاء کو حقیقی معنوں میں مقبول بنانے کی قیمت ہے۔ وہ عہد ہے: خدا کی مخلصانہ اطاعت کا اور اس پر اپنے ایمان ویقین کو زندہ اور پختہ کرنے کا۔ اسی عہد کی شعوری پابندی کے ذریعہ اہلِ ایمان کو ''رُشد وہدایت'' کی توفیق ملتی ہے یعنی ان پر ہر قسم کی فلاح وسعادت کے دروازے کھلتے ہیں۔

اگر دعاء کے ساتھ آپ کے اندر ایمان اور اطاعت کے اس عہد کی تجدید کا گہرا شعور بیدار نہ ہو، تو عین ممکن ہے کہ اس کے باوجود خدا اپنی بے نیازی اور سخاوت سے آپ کو وہ چیز دے دے جو آپ نے طلب کی مگر اندیشہ ہے کہ وہ چیز انجامِ کار آپ کے لئے ''رُشد وہدایت'' کا باعث نہ ہو، بلکہ خدا سے ''غفلت'' اور اس کی ''معصیت'' کا سبب بن جائے۔ گویا خدا سے مانگتے ہوئے آپ کو یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ آپ کو اسے کچھ ''دینا'' بھی ہے اور وہ ہے ایمان اور اطاعت کا سچا عہد و پیمان۔ آپ کی ''مانگ'' اسی وقت آپ کے حق میں بابرکت اور موجبِ سعادت بنے گی جب آپ اس کی مطلوبہ قیمت چکانے کے لئے صدقِ دل سے تیار ہوں۔

بروز بدھ، ۷ رجون، ۱۲ ررمضان ۲۰۱۷ء

روزہ: قرآنی زندگی کی تمہید

سورہ البقرہ، آیت 183 میں رمضان کے روزے کی فرضیت کا مقصد اللہ تعالی نے یہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذریعہ اہلِ ایمان کے اندر تقوی (خداشناسی اور خداترسی) کی صفت پیدا ہو۔ پھر اس کی اگلی آیت کے بعد (البقرہ، 185) میں بتایا گیا ہے کہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا، تمام انسانوں کی رہنمائی کے لئے اور ہدایت کے روشن دلائل اور حق و باطل کا فیصلہ کُن معیار فراہم کرنے کے لئے۔

دوسری طرف قرآن کے بالکل شروع (سورہ البقرہ، آیت 2) میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس کتابِ لاریب سے عملاً وہی لوگ ہدایت اور رہنمائی لے سکتے ہیں جن میں تقوی کا جوہر موجود ہو (هُدىً للمتقين)

مذکورہ تینوں آیات کا مجموعی خلاصہ یہ ہوگا کہ روزہ بیک وقت ایک مستقل عبادت بھی ہے اور

قرآنی زندگی کی تمہید بھی - روزہ کو کما حقہ ادا کرنے سے ایک طرف تقوی اسپرٹ پیدا ہوگی اور پھر یہی تقوی اسپرٹ وہ قوتِ محرکہ (Driving Force) ہے جو ایک صاحبِ ایمان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ قرآنی ہدایات کے مطابق اپنی شخصیت کی ربانی تشکیل اور اپنی زندگی کو قرآن کی عملی تصویر بنا سکے تاکہ آخرت میں خدا کی ابدی جنت کا مستحق قرار پائے۔

بروز جمعرات، ۸/جون، ۱۳/رمضان ۲۰۱۷ء

ربانی صبر

رمضان کو ایک حدیث میں "شهر الصبر" یعنی صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ صبر کی تمام قسموں کا جامع ہے۔ چنانچہ یہ پورا مہینہ، صبر کا مہینہ قرار پایا۔

علماء نے صبر کی مختلف تعریفیں اور اقسام بیان کی ہیں جن کا خلاصہ تین وسیع عنوانات کے تحت یہ ہوگا (۱) اللہ کے احکام کی اطاعت پر صبر؛ جو راہِ راست پر استقامت اور ثابت قدمی کے ہم معنی ہے (۲) اللہ کی ممنوعہ چیزوں سے بچنے پر صبر (۳) قدرتی آلام و مصائب (مثلاً: بھوک، پیاس، بیماری، مالی تنگ دستی، اور ناگہانی آفتیں وغیرہ) نیز دعوت و اصلاح کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات، دل شکن تجربات اور دوسروں کی ایذاء رسانیوں پر صبر۔

تاہم صبر کی ایک نہایت لطیف اور شاید اعلیٰ ترین قسم وہ ہے جسے "ربانی صبر" (Divine Patience) کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد اس ذہنی تکلیف اور نفسیاتی اذیت کو برداشت کرنا ہے جو اپنے ایک جائز اصولی حق کو لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے دست بردار ہونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک شخص آپ کے ساتھ بدکلامی کرے، یا آپ کی کسی چیز پر ناجائز قبضہ کر لے، یا آپ کا کوئی علمی یا عملی کارنامہ اپنے یا کسی اور کے نام منسوب کر دے، یا جس پوزیشن کے آپ حقدار تھے اسے کسی سازش کے تحت کوئی اور حاصل کر لے۔

ان تمام حالتوں میں آپ کو ایک ناقابلِ برداشت ذہنی کرب کے طوفان سے گزرنا پڑتا ہے اور بظاہر آپ کے لئے یہ ممکن نظر آتا ہے کہ جوابی یا انتقامی کارروائی کے ذریعہ اپنا حق بحال

کرلیں یا کم از کم اپنے جذبات کی تسکین کا سامان کریں مگر آپ صرف خدا کی خاطر اس کو بلا بحث سہ جاتے ہیں تو اس وقت گویا آپ "ربانی صبر" کا تجربہ کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح خدا، قادرِ مطلق ہونے کے باوجود، اپنی شان میں گستاخی کرنے والے مجرموں کو اپنی بنائی ہوئی کائنات میں برداشت کرتا ہے اور انہیں مقررہ وقت تک زندگی کی تمام آسائشوں کا سامان فراہم کرتا ہے، اسی طرح آپ اپنی محدود قدرت کا استعمال اپنے حریف یا بدخواہ کے خلاف نہیں کرتے اور اس کے معاملہ کو قادرِ مطلق کے حوالے کر دیتے ہیں۔

روزہ مختلف پہلوؤں سے اہلِ ایمان کو اسی ربانی صبر کی عملی تربیت دیتا ہے اور ایسے ہی صابر بندوں کے لئے خدا نے بے حساب اجر کا وعدہ کیا ہے۔ ("إنما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب") (سورہ الزمر، آیت ۱۰)

بروز جمعہ، ۹/جون، ۱۴/رمضان ۲۰۱۷ء

تخلیہ اور تحلیہ

تزکیۂ نفس کے دو بنیادی پہلو ہیں، ایک تخلیہ اور دوسرے تحلیہ۔

تخلیہ کا لفظی مطلب ہے خالی کرنا۔ یہ گویا ایک قسم کی ذہنی و نفسیاتی جراحی (Psychological & Intellectual Sugery) ہے، جس کے ذریعہ آپ اپنے اندرون کو، قرآنی اصطلاح میں "فجور" سے پاک کرتے ہیں۔ یعنی ہر قسم کی وہ اعتقادی خامیاں (شرک و ریاء وغیرہ) اور فکری و جذباتی کمزوریاں (غصہ، انانیت، سطحیت، عاجلہ پرستی، حرص و حسد، بغض و عناد، گھمنڈ وغیرہ)، جن کی بنا پر آپ روزمرہ زندگی میں اخلاق و عمل کی مختلف برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

تحلیہ کے لفظی معنی ہیں سنوارنا۔ اس سے مراد اپنے باطن اور ظاہر کو قرآن کی اصطلاح میں "تقوی" کے اوصاف سے آراستہ کرنے کی سنجیدہ اور منظم کوشش ہے، یعنی توحید پر ایمان کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح زندہ اور پختہ کرنا کہ وہی آپ کے فکر و شعور اور احساسات و جذبات کا دائمی مرکز و محور بن جائے اور پھر عملِ صالح (خالق کی مخلصانہ عبادت اور مخلوق کی بے لوث خدمت وغیرہ) کے

ذریعہ اپنے اخلاق وکردار کی ربانی تشکیل کے لئے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت پُرجوش طور پر سرگرم رکھے۔

رمضان کے صیام وقیام اور اس کے متعلقہ ضوابط کو اگر گہرے فہم وشعور کے ساتھ اپنایا جائے، تو وہ حیرت انگیز طور پر ایک صاحبِ ایمان کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ تزکیۂ نفس کے ان دو گونہ تقاضوں (تخلیہ اور تحلیہ) کو پورا کر سکے اور اپنی شخصیت اور کردار کو ربانی پیکر میں ڈھال کر بالآخر جنت کی شہریت کا مستحق بن جائے۔ ان شاء اللہ۔

بروز سنیچر، ۱۰؍جون، ۱۵؍رمضان ۲۰۱۷ء

پیغمبرانہ حکمتِ عملی (۱/۲)

آج تراویح میں سورۂ یوسف پڑھی گئی۔

سورۂ یوسف ایک سو گیارہ آیتوں پر مشتمل ہے۔ قرآنی ترتیب میں وہ بارہویں نمبر پر ہے۔ پوری سورہ میں پچیس سے زاید بار حضرت یوسفؑ کا بنام ذکر آیا ہے۔ مفسرین کے مطابق وہ ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے ''عام الحزن''، یعنی سالِ غم میں اس وقت نازل ہوئی جبکہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے صدمے کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے خلاف مکہ والوں کی دشمنی اور ایذارسانی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی اور تمام قبائل نے مل کر آپ کے قتل کا ظالمانہ منصوبہ بھی بنالیا تھا۔

اس پسِ منظر میں سورۂ یوسف گویا پیغمبرِ اسلام (ﷺ) اور اہلِ اسلام کے لئے بالواسطہ انداز میں اس بات کی پیشگی خوش خبری تھی کہ ''آج'' کے بظاہر مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود ان کا ''کل'' بہت شاندار اور کامیاب ہونے والا ہے۔ البتہ اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ ہر حال میں ''تقویٰ'' اور ''صبر'' کی روش پر ثابت قدم رہیں۔ کیونکہ محض تقویٰ اور صبر ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ انسان ایک طرف زندگی اور کائنات کی ربانی اسکیم کو گہرائی سے سمجھے اور غیر مشروط طور پر اس سے ہم آہنگ ہو جائے اور دوسری طرف وہ ''اپنوں'' اور ''غیروں'' کی تمام ''سازشوں'' کے منفی اثرات کی زد سے نہ صرف محفوظ ہو جائے بلکہ وہی ''سازشیں'' بالآخر اس

کی کامیابی کے مواقع کھولنے اور اس کی سربلندی کی راہیں ہموار کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

سورۂ یوسف ربانی معرفت، روحانی بصیرت اور اخلاقی حکمت وعبرت کا اتھاہ خزانہ ہے۔

اس کے نمایاں ترین اسباق کی مختصر فہرست یہ ہوگی: خدا پر زندہ ایمان، آخرت پر گہرا یقین، دنیوی آلام ومصائب اور انسانی ظلم وزیادتی پر صبر، حاسدوں اور بدخواہوں کی سازش کا مقابلہ بذریعہ توکل علی اللہ واستعانت باللہ، توحید کی دعوت، پاکدامنی اور عالی ظرفی، تقویٰ، احسان، امانت داری، قناعت پسندی اور خودداری، نعمتوں کی قدرشناسی اور شکرگزاری، قدرت کے باوجود عفو ودرگزر، علم ودانش اور مستقبل بینی کی بنیاد پر سرکاری مالیات کا مثالی نظم ونسق، تنظیمِ بحران (Crisis Management) اور رفاہِ عام کی منصوبہ بندی (Public Welfare Planning) اور اس کا مؤثر عملی نفاذ وغیرہ۔

بروز اتوار، ۱۱؍جون، ۱۶؍رمضان ۲۰۱۷ء

پیغمبرانہ حکمتِ عملی (۲/۲)

موجودہ عالمی حالات کے پسِ منظر میں تدبر کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں سورۂ یوسف یا ''اُسوۂ یوسفی'' میں آج کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا اور اہم ترین سبق وہ حکمتِ عملی ہے جسے سیاسی ہم آہنگی (Political Adjustment) کہہ سکتے ہیں۔ یعنی کسی بھی ملک کے قائم شدہ نظامِ اقتدار اور اس کے آئینی یا تعزیری قوانین کو 'اعتقاد' (دوسرے لفظوں میں کفر اور ایمان) کا مسئلہ بنائے بغیر اس کے دائرے میں پُرامن طور پر رہتے ہوئے اپنے انفرادی، خانگی اور اجتماعی مسائل کا مثبت عملی حل تلاش کرنا۔ ذاتی طور پر اپنے عقیدۂ توحید کو درست اور مستحکم بناتے ہوئے، حسبِ امکان اس کی دعوت دینا، جیسا کہ معلوم ہے حضرت یوسفؑ نے جیل خانے میں قیدیوں کو دعوتِ توحید دی، مگر شاہی محل میں اس کا امکان نہیں تھا۔

اسی طرح قید خانہ میں انہوں نے صرف دعوتِ توحید دی۔ وقت کے سیاسی نظام کے خلاف کوئی انقلابی منصوبہ نہیں پیش کیا نہ ہی مروجہ عدالتی قوانین اور ضوابط پر کسی قسم کا تبصرہ یا تنقید کی۔ بلکہ

اسے ''قضاءِ الٰہی'' قرار دے کر خاموشی کے ساتھ تسلیم کیا (سورۂ یوسف، آیت، 41)-مزید یہ کہ اس کے تحت اگر ایک مومن و مسلم کو کوئی سرکاری عہدہ مل جائے تو وہ پوری امانت اور دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ اپنی امتیازی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوتے بہترین خدمات پیش کرے جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے پیش کیا۔

خود اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنے کے لئے انہوں نے خدا کی طرف سے جو خصوصی الہامی تدبیر اختیار کی، وہ بھی دین الملک (آیت 76) یعنی مروجہ شاہی ضابطوں کے عین مطابق تھی۔ گویا قانون شکنی کا طریقہ پیغمبرانہ حکمتِ عملی کے منافی ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مفسر شیخ جمال الدین القاسمی اپنی تفسیر ''محاسن التنزیل'' میں لکھتے ہیں کہ ''یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یوسفؑ بادشاہ کے قانون سے تجاوز نہیں کرتے تھے ورنہ وہ اپنی مرضی چلاتے۔ یہ طرزِ عمل ان کی کامل ذہانت اور حکمت کا ثبوت ہے۔ نیز اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ کافرانہ مذاہب کے قوانین کو ''دین'' کہنا جائز ہے اور اس ضمن میں اور بہت سی آیات موجود ہیں (''...وفیه إعلام بأن یوسف ما کان یتجاوز قانون الملك، وإلا لاستبد بما شاء. وهذا من وفور فطنته و کمال حکمته. ویستدل به علی جواز تسمیة قوانین ملل الکفر (دیناً) لها والآیات فی ذلك کثیرة'')

بحیثیتِ مجموعی اہلِ اسلام کے لئے ''اسوۂ یوسفی'' کی اہمیت کی تایید میں اتنا کافی ہے کہ اس سورہ کے خاتمے پر آیت نمبر 108 میں پیغمبرِ اسلام کی زبانی یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ یہی حکمتِ عملی خود پیغمبرِ اسلام کا راستہ بھی ہے: ''قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ'' (سورۂ یوسف، آیت، 108)

''کہہ دو: یہ ہے میرا راستہ؛ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں؛ خوب سمجھ بوجھ کر میں بھی اور میرے پیرو بھی۔ اور خدا پاک ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں'' (سورۂ یوسف، آیت، 108)

عادت اور عبادت

الطبرانی نے سہل بن معاذ بن انسؓ سے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے: ''ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کہ: اے اللہ کے رسول، سب سے بڑا اجر پانے والا مجاہد کون ہے؟ آپؐ نے کہا: جو سب سے زیادہ خدا کو یاد کرے۔ اس نے پھر پوچھا کہ: سب سے بڑا اجر پانے والا روزہ دار کون ہے؟ آپ نے کہا: جو سب سے زیادہ خدا کو یاد کرے۔ پھر اس شخص نے نماز اور زکوۃ اور حج اور صدقہ کے حوالے سے یہی سوال کیا اور ہر بار اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: جو سب سے زیادہ خدا کو یاد کرے۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ: ذکر کرنے والے تو سارا خیر لے کر چلے گئے۔ اس پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یقیناً''۔

اللہ کے ذکر سے مراد یہاں محض کچھ اوراد و وظائف کی زبانی تکرار نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد خدا کی ذات وصفات کا وہ شعوری ادراک واستحضار (Conscious Awareness & Visualization) ہے جس کے تحت ایک مومن اپنے دل و دماغ کی سطح پر گویا ہر وقت خدا کو دیکھتا ہے یا کم از کم خدا کے دیکھنے کو دیکھتا ہے۔

خدا کے ہمہ وقت حاضر و ناظر ہونے کا یہ یقین جس قدر آپ کے اندرون کی گہرائی میں سمایا ہوگا اسی قدر آپ کا روزہ اور نماز اور زکوۃ اور حج اور صدقہ وغیرہ بے جان ''عادات'' کے بجائے زندہ ''عبادات'' کی شکل اختیار کریں گے اور اسی تناسب سے آپ کو ان کا اجر بھی ملے گا۔

اس کی وضاحت مسندِ احمد کی ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عمار بن یاسرؓ سے یوں مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمایا کرتے کہ: ''بندہ نماز پڑھتا ہے مگر وہ اس کے حق میں نہ آدھی شمار ہوتی ہے، نہ ایک تہائی، نہ ایک چوتھائی اور نہ اس کا پانچواں اور چھٹا اور دسواں حصہ اجر ہی اس کو ملتا ہے۔ کیونکہ بندہ کو اس کی نماز سے اسی قدر (اجر یا فائدہ) حاصل ہوتا ہے جس قدر وہ اس کا شعوری ادراک کرتا ہے: "إنما یکتب للعبد من صلاته ما عقل منها"

ذکرِ الٰہی درحقیقت فکر وشعور کی پاکیزگی اور ارتقاء کا وہ مقام ہے جہاں ایک صاحبِ ایمان ''ان دیکھے خدا'' کو سب سے زیادہ ''دیکھنے'' لگتا ہے، محسوسات کے ہجوم میں وہ خدائی صفات کی ''غیر محسوس'' تجلیات کو سب سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی ''نعمت'' اسے ''مُنعِم'' کی حمد وثناء سے سرشار کرتی ہے اور ہر چھوٹی بڑی ''مصیبت'' اسے اپنی عاجزی کے احساس میں ڈبو کر قادرِ مطلق کی پناہ کا طلبگار بنا دیتی ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو اس کی ہر ''عادت'' کو ''عبادت'' بناتی ہے اور جس کے بغیر ہر عبادت محض ایک بے روح عادت بن کر رہ جاتی ہے۔

بروز منگل، ۱۳ر جون، ۱۸ر رمضان ۲۰۱۷ء

دو مسرتیں

سورج ڈوبا۔ مغرب کا وقت ہوا۔ روزہ دار نے کھجور، پانی، پھل اور دیگر اشیائے خور ونوش کے ذریعہ افطار کیا۔ دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت سے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی اور بشاشت کی لہر دوڑ گئی اور پورے بدن میں، نڈھال پن کی جگہ سیرابی اور شکم سیری کا مسرت بخش احساس ایک نئی زندگی، نئی توانائی بن کر جاری وساری ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ایمانی حِس اور اسلامی شعور کے تحت، اس کی زبان سے بے ساختہ خدا کی حمد وثناء اور شکر گزاری کے کلمات نکلنے لگے۔ جس نے اس کو مزید روحانی کیف وسرور سے سرشار کر دیا۔ یہ ایک ایسی مسرت ہے جس کا تجربہ ایک باشعور روزہ دار کو روزانہ بوقتِ افطار ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔

روزہ دار اگر افطار کے وقت مزید غور وفکر سے کام لے تو اس کا دسترخوان صرف جسم کو تقویت پہنچانے والی خوراک کا نہیں، بلکہ اس کی روح کا تزکیہ کرنے اور اس کے ملکوتی جوہر کو نکھارنے والا ربانی معرفت کا دسترخوان بن جائے۔ وہ سراپا عجز اور حیرت کا پیکر بن کر سوچے گا کہ یہ پانی جو میری پیاس بجھاتا ہے اور یہ کھانا جو میری بھوک مٹاتا ہے، ان کو وجود میں لانے کے لئے زمین وآسمان سمیت اس لامتناہی کائنات کے کھربوں عناصر، خود میرے وجود میں آنے سے کھربوں سال پہلے سے مسلسل اور حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ میرا وہ خالق اور رازق کتنا

مہربان، کتنا حکیم اور کیسی بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے، جو تنہا مجھ جیسی عاجز وناتواں مخلوق کو اتنی فیاضی سے تمام سامانِ زندگی فراہم کرتا ہے۔

پھر اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ یقین ابھرتا ہے کہ جس طرح میری موجودہ زندگی کے لئے خدا نے مجھے ایسے بیش قیمت اسباب پیشگی مہیا کئے ہیں، وہ مرنے کے بعد آنے والی میری ابدی زندگی کو بلاشبہ ان تمام آسودگیوں اور مسرتوں سے بھر سکتا ہے جو کبھی میرے خواب وخیال میں گزریں یا میرے تخیل کی گرفت سے باہر رہیں۔ یہ یقین اس کے اندر اپنے رحمن ورحیم پروردگار سے ملاقات کا سچا شوق اور تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔

اس طرح گویا روزہ اور افطار ایک باشعور مومن کے لئے روزانہ دو لطیف مسرتوں کا عملی تجربہ بن جاتا ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ایک مشہور حدیث میں رسول اللہ (ﷺ) نے انہیں دو مسرتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کرتے وقت اور دوسری خوشی جب وہ اپنے پروردگار سے ملے گا''۔ **(للصائم فرحتان: فرحة حين يفطر، وفرحة حين يلقى ربه)**

بروز بدھ، ۱۴ر جون، ۱۹ر رمضان ۲۰۱۷ء

روزہ: حیات بعد الموت کی تیاری (۱/۲)

آج بوقتِ سحر ایک رشتے دار خاتون کے انتقال کی خبر ملی۔ ''إنا لله وإنا إليه راجعون''۔۔۔ اللہ تعالی مرحومہ کی مغفرت فرمائے، ان ہر اپنی رحمتوں کا سایہ کرے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

موت کو حدیث میں "**هادم اللذات**" (لذتوں کو ڈھا دینے والا) کہا گیا ہے اور اسے مسلسل یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی صبح وشام اپنی انگلیوں یا تسبیح کے دانوں پر ''موت، موت'' کا ورد کرے۔ یہ دراصل موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں سنجیدہ غور وفکر کی نصیحت ہے تا کہ انسان اپنی موت سے پہلے اس کی مطلوبہ تیاری کرلے ورنہ اس کے بعد کسی کو ایک

لمحے کے لئے بھی اس بات کی مہلت نہ ملے گی کہ وہ اپنی کسی سابقہ کوتاہی یا بدعملی کی تلافی کر سکے۔ گویا موت کو یاد کرنے کا مطلب اسے اپنے لئے حسنِ عمل اور خدا کی صراطِ مستقیم پر چلنے کا محرک بنانا ہے۔

انسان کی موجودہ زندگی جتنی یقینی ہے اتنا ہی یقینی موت کے ذریعہ اس زندگی کا خاتمہ بھی ہے۔ جس سے ہر شخص کو جلد یا بدیر لامحالہ دوچار ہونا ہے۔ (كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ سورہ آل عمران، آیت، 185) مگر اکثر لوگ اس سنگین، اٹل اور یقینی خاتمۂ حیات سے اتنا غافل ہیں جیسے اس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ جیسے انہیں کبھی مرنا ہی نہیں۔

موجودہ زندگی ہر انسان کو ''بے مانگے'' ملتی ہے۔ وہ خالق کا ایک یک طرفہ عطیہ ہے اور موت اس عطیۂ زندگی کا کسی پیشگی اعلان یا ''نوٹس'' کے بغیر اس کے خالق کے حکم سے واپس لئے جانے کا نام ہے۔ ''عطیۂ زندگی'' کو دینے اور پھر اسے ایک مختصر یا نسبتاً طویل مدت کے بعد اچانک واپس لینے کا فیصلہ یک طرفہ طور پر خالق خود کرتا ہے۔ ظاہری اسباب خواہ کچھ ہوں، تاہم زندگی اور موت دونوں کا اوّل اور آخر صرف ایک ہی حقیقی سبب ہے اور وہ ہے خالق کا خودمختارانہ فیصلہ، جس میں کسی مخلوق کو کسی قسم کی مداخلت کا مطلق اختیار نہیں۔ چھوٹے اور بڑے، بادشاہ اور فقیر اور طاقتور اور کمزور سب زندگی اور موت کے اس خدائی فیصلے کے آگے یکساں طور پر بے بس ہیں۔ بقیہ تمام ''اسباب'' دراصل اس ''اولین حقیقی سبب'' کے نتائج ہیں نہ کہ بذاتِ خود سبب۔

خالقِ موت وحیات کے اس خودمختارانہ فیصلہ کو شعوری طور پر ماننے اور اس پر راضی ہونے کا اظہار ایک مومن ومسلم ''استرجاع'' کے ان بامعنی الفاظ میں کرتا ہے "إنا لله وإنا إليه راجعون"، یعنی ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم بالآخر اسی کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

بروز جمعرات، ۱۵/ جون، ۲۰/ رمضان ۲۰۱۷ء

روزہ: حیات بعد الموت کی تیاری (۲/۲)

البتہ زندگی اور موت کے درمیان کی جو مختصر یا طویل مدت ہے، اس میں ہر انسان کو اپنی مرضی سے کچھ ''کرنے'' اور کچھ ''نہ کرنے'' کے ''اختیارات'' حاصل ہیں۔ انھیں محدود وقتی اختیارات

کے صحیح یا غلط؛ بالفاظ دیگر اپنی ذاتی مرضی یا خالقِ موت وحیات کی مرضی کے مطابق استعمال پر انسان کی اگلی زندگی کی ابدی کامیابی یا ابدی ناکامی کا دارومدار ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو روزہ ایک مومن کو حیات بعد الموت کی ابدی کامیابی کے لئے تیار کرتا ہے۔ کیونکہ روزہ عملاً اپنے نفس کی سطح پر خود کو جیتے جی مارنا ہے۔ وہ موت کی طرح اپنے تئیں ''هادم اللذات'' بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو بے اختیار بنا لینے اور آنے والی دائمی راحت ومسرت کی خاطر اپنی موجودہ وقتی راحت ومسرت کو اپنے ہاتھوں ڈھانے کی مشق ہے۔

یہ ''خودمختارانہ بے اختیاری'' اور خالقِ موت وحیات کے حکم سے ''کل'' کے لئے اپنے ''آج'' سے دست بردار ہو جانا، دراصل یہی وہ ''اسلام'' فرمانبردارانہ خودسپردگی (Obediently Self-Surrender) ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے، اور جس کے عوض میں آخرت کی پُرمسرت اور ہر قسم کے خوف وغم سے خالی، لازوال بہشتی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے: ''بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ'' (البقرہ، آیت 112)

جو شخص اس ''اسلامی اسپرٹ'' کے مطابق رمضان کے روزے رکھے، اس کی پوری شخصیت اور کردار مستقل طور پر اسلام کے پیکر میں اپنے آپ ڈھلتے چلے جائیں گے اور وہ اس صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہ سکے گا جو اسے موت کے بعد خدا کی جنت تک پہنچائے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص رمضان میں بظاہر کھانا پینا اور دوسری جائز چیزوں بلکہ ناگزیر ضرورتوں کو ترک کر دے، وہ رمضان یا غیر رمضان میں، جھوٹ، غیبت، کینہ، بغض، سودخواری، شراب نوشی، مکروفریب، عہدشکنی، کردارکشی اور فتنہ انگیزی جیسی حرام چیزوں سے خود کو نہ بچائے۔ اگر کوئی روزہ رکھتے ہوئے یا اس کے بعد ان محرمات کا دانستہ ارتکاب کرتا ہے تو اس کا روزہ محض ایک سماجی روایت یا بے جان عادت شمار ہوگا نہ کہ ایک حي وقیوم پروردگار کی زندہ عبادت۔

سچا روزہ دار وہی ہے جس کا روزہ اسے زندگی کے ہر معاملے میں اپنے ''مختارِ کُل'' خالق و مالک کے آگے مکمل ''بے اختیار'' ہو جانے کا سلیقہ سکھائے تاکہ وہ اس دنیا کو اپنی آخرت کی کھیتی پروان

چڑھانے اور موجودہ زندگی کو حیات بعد الموت کی حقیقی تیاری میں استعمال کر سکے۔

بروز جمعہ، ۱۶ر جون، ۲۱ر رمضان ۲۰۱۷ء

دعائے لیلۃ القدر (۱/۳)

مشہور حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ (ﷺ) سے غالباً رمضان کے آخری عشرہ کے دوران پوچھا کہ اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو میں اللہ سے کیا دعاء مانگوں؟ اس موقع پر آپ (ﷺ) نے انھیں یہ مختصر اور جامع دعاء سکھائی: ''أللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عني''؛ یعنی اے اللہ تو بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے، تو عفو ودرگزر کو پسند کرتا ہے لہذا مجھے معاف کردے''۔

اس دعائے نبوی میں تفکر اور تدبر کرنے سے ایک صاحبِ ایمان کو دین کی چند نہایت گہری حقیقتوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے مانگنے کی اہم ترین چیز کیا ہے، دوسرے یہ کہ جو چیز آپ خدا سے مانگ رہے ہیں، وہی چیز بشریت اور عبدیت کے دائرۂ استطاعت میں خدا کو بھی آپ سے مطلوب ہے۔ تیسرے یہ کہ خدا کی معافی کسی کو بے طلب نہیں مل سکتی بلکہ وہ صرف معافی کے ایسے سنجیدہ طلبگار کو ملے گی جو خدا سے مانگنے کے سب سے بہترین موقع پر اسی کا عاجزانہ اور والہانہ سوال کرے۔

مذکورہ دعائے نبوی کی تعلیم جس پسِ منظر میں دی گئی وہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ خدا سے مانگنے کی اصل چیز دنیا کی وقتی آسائشیں اور فانی رونقیں نہیں، بلکہ وہ چیز ہے جو آپ کے لئے آخرت کی ابدی فلاح وسعادت کا دروازہ کھول دے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حشر کے دن جب آپ خدا کے سامنے حاضر ہوں تو وہ آپ کے ساتھ ''عفو ودرگزر'' کا معاملہ کرے، اس کی بنائی ہوئی حسین کائنات میں اپنی آزادی کے دانستہ یا نادانستہ غلط استعمال سے آپ نے خود اپنی اور دوسروں کی زندگی میں جو مادی آلودگی اور معنوی اور اخلاقی فساد پیدا کیا تھا، اسے وہ اپنی قدرت کاملہ سے مٹادے تاکہ آپ ''نفسِ مزکی'' بن کر جنت کی نفیس دنیا میں رہائش کے قابل ہوسکیں۔

بروز سنیچر، ۱۷ر جون، ۲۲ر رمضان ۲۰۱۷ء

دعائے لیلۃ القدر (۲/۳)

دوسری حقیقت جو اس پیغمبرانہ دعاء میں مضمر ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ یہ الفاظ کہتے ہیں کہ ''اے اللہ، تو بہت معاف کرنے والا ہے؛ تو معافی کو پسند کرتا ہے''، تو اس کے ساتھ آپ یہ غیر ملفوظ اعلان بھی کرتے ہیں کہ خدا کو جس طرح ''معافی پسند ہے''، اسی طرح وہ ''معاف کرنے والے کو بھی پسند کرتا ہے'' اور اس کا لازمی تقاضہ یہ ہوجاتا ہے کہ آپ خود بھی دوسروں کی خطاؤں اور کوتاہیوں کو معاف کرنے والے بنیں۔ اگر آپ بندگانِ خدا کو عفو ودرگزر دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے، جو خود آپ کے اقرار کے مطابق خدا کو بہت پسند ہے؛ تو پھر آپ کا اس سے اپنے لئے عفو ودرگزر کا سوال کرنا ایک ایسا غیر سنجیدہ فعل بن جاتا ہے جو ایمان اور اسلام کی حقیقی روح کے منافی ہے کیونکہ ایک سچا مومن و مسلم دوسروں کے لئے وہی چاہتا ہے، جو وہ خود اپنے لئے چاہتا ہے (لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه- رواہ البخاري)

چنانچہ اس صفتِ عفو ودرگزر کو اہلِ ایمان کے انفرادی اور اجتماعی کردار کا اٹوٹ اور سب سے نمایاں حصہ بنانے کے لئے ایک موقع پر جب کسی نے پوچھا کہ ''دن بھر میں مجھے اپنے نوکر کو کتنی بار معاف کرنا چاہئے''، تو پیغمبرِ اسلام (ﷺ) نے جواب دیا: ''روزانہ ستر (70) بار معاف کرو''۔ گویا آپ کو خدا کی ''معافی پانے والا'' (Pardon-receiver) بننے کے لئے اس کے بندوں کو ''معافی دینے والا'' (Pardon-giver) بننا ہوگا۔ اِس مفہوم کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں پیغمبرِ اسلام (ﷺ) نے فرمایا کہ: ''جو رحم کرنے والے ہیں، انہیں کے ساتھ خدائے رحمان بھی رحم کا معاملہ کرے گا'' (الراحمون يرحمهم الرحمان- رواہ الترمذي)۔

بروز اتوار، ۱۸ر جون، ۲۳ر رمضان ۲۰۱۷ء

دعائے لیلۃ القدر (۳/۳)

اس دعاء کا تیسرا غور طلب اور نہایت سنگین پہلو یہ ہے کہ خدا کی معافی، بالخصوص آخرت

میں، کسی کو ''بے مانگے'' نہیں ملے گی، بلکہ ہر شخص کو بطورِ خود اس دنیا میں مرنے سے پہلے اس سے معافی کی سنجیدہ، عاجزانہ اور والہانہ دعائیہ درخواست کرنی پڑے گی نیز اس کے لئے شب و روز کے دوران قبولیتِ دعاء کے خاص اوقات کا مستعدی اور دلجمعی سے استعمال کرنا ہوگا جو اس معاملے میں اس کی سنجیدگی کا ثبوت ہو۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ آخرت میں ''عفوِ الٰہی'' کا سزاوار نہ ٹھہرایا جائے۔

خدا نے اپنی فیاضانہ ربوبیت کے تحت اس دنیا میں انسان کو ہر وہ شئے مفت دے رکھی ہے جس کی اسے زندہ رہنے کے لئے ضرورت پڑتی ہے یا پڑسکتی ہے۔ یہ ہوا اور پانی اور روشنی جن کے بغیر زندگی ناممکن ہے، یہ زرخیز زمین جو ہر ذی حیات کے لئے خوراک کا قدرتی بھنڈار بھی ہے اور خالق کی معجزاتی صناعی اور اس کے جمال وکمال کا پُراسرار اور دل آویز مرقع بھی۔ پھر یہ سورج اور چاند اور ستاروں کا جُھرمُٹ اور فضائے آسمانی کی لامتناہی وسعتوں میں بکھری ہوئی اس سے بھی اربوں گنا بڑی کھربوں کہکشائیں۔ یہ سب کچھ رب العالمین نے، محض اپنے فیضانِ رحمت سے، بے مانگے اور بلا معاوضہ فراہم کر رکھا ہے جن پر انسان کا حیاتیاتی بقاء اور تہذیبی وتمدنی ارتقاء منحصر ہے۔

تاہم آخرت میں ''عفوِ الٰہی'' اور اس کی بنا پر جنت میں داخلہ کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ جنت خدا کی سب سے بیش قیمت تخلیق ہے۔ ایک حدیث میں اسے خدا کا مہنگا سامانِ فروخت کہا گیا ہے (أَلاَ إِنّ سِلْعَةَ اللهِ غَالِيَةٌ أَلاَ إِنّ سِلْعَةَ اللهِ الْجَنّةُ) گویا وہ اس پوری کائنات سے بے حساب گنا زیادہ قیمتی اور بے نظیر اور لازوال حسن وکمال کا مظہر ہے، اس لئے وہ کائنات کی طرح کسی کو مفت میں نہیں مل جائے گی۔ وہ صرف انہیں بندگانِ خدا کو دی جائے گی جو اپنی زندگی کے بہترین لمحات میں اس کے لئے عاجزی اور عبودیت کے آنسوؤں میں ڈوبی درخواست اپنے پروردگار کے سامنے پیش کرتے تھے۔

''اے اللہ، مجھے معاف کردے'' بظاہر ایک سادہ سا جملہ ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ایک مومن کی خود شناسی، خدا شناسی، وقت شناسی اور آخرت شناسی کی نہایت جامع اور موزوں ترین تعبیر ہے۔ ان الفاظ کو زندہ ایمانی شعور اور اخلاص سے کہنے والا دراصل ڈر اور امید کے مشترک جذبات پر مشتمل یہ اقرار آمیز التجا کرتا ہے کہ: خدایا، میں خطاکار ہوں اور ایک دن یقیناً تو مجھ سے ان خطاؤں کی باز پُرس

کرنے والا ہے۔ تو اس ''یوم الحساب'' یا ''روزِ جزاء'' کا مالک اور مُنصف ہے۔ اس لئے تو مجھے ان خطاؤں پر سخت ترین سزا دینے کا پورا اختیار اور قدرت رکھتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ تو رحمن و رحیم اور عفو وغفور اور تواب وحکیم بھی ہے اور تیری انھیں کریمانہ صفات کے واسطے سے میں یہ عاجزانہ گزارش کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کردے۔

غالباً اسی جامعیت اور وسیع وعمیق معنویت کی بنا پر اسے لیلۃ القدر جیسی مبارک ترین رات کی خصوصی دعاء قرار دیا گیا۔

بروز پیر، ۱۹ر جون، ۲۴ر رمضان ۲۰۱۷ء

روزہ داری: ربانی اوصاف کی آئینہ داری (۱ / ۲)

''روزے کے مقاصد وفوائد کو چند لفظوں میں کس طرح بیان کیا جائے؟'' ۔آج فجر بعد ذہن میں یہ سوال ابھرا اور پھر اس کا جواب سوچتے ہوئے بے ساختہ یہ عبارت زبان پر آ گئی: ''روزہ داری: ربانی اوصاف کی آئینہ داری''، جو میرے خیال میں بڑی حد تک روزے کے اغراض ومقاصد اور اس کے متوقعہ عملی نتائج کا احاطہ کرتی ہے۔

غور کیجئے تو روزہ بحیثیتِ مجموعی ایک مومن کی شخصیت کو گویا "صبغة الله" یعنی خدائی صفات کے رنگ میں رنگنے کا عمل ہے۔ اس بنیادی فرق کے ساتھ کہ جو صفاتِ جمال وکمال خدائے وحدہ لاشریک کی برتر و بے مثل ذات میں مطلق اور ازلی طور پر موجود ہیں ایک صاحبِ ایمان کو روزہ (نیز کم وبیش دیگر عبادات کے ذریعہ) ان کا بشری سطح پر ایک محدود تجرباتی عرفان حاصل ہوتا ہے جس سے اس کے احساسِ عبدیت میں گہرائی اور پختگی آتی ہے اور وہ ربانی اوصاف بتدریج اس کے فکر وکردار کا مستقل شعوری حصہ بنتے جاتے ہیں۔

مثلاً روزے میں کھانے پینے اور دیگر نفسانی تقاضوں سے وقتی طور پر دستبردار ہونا، اللہ کی صفت ''الصمد'' (ہر شئے سے بے نیاز، ہر ضرورت سے پاک، بذاتِ خود قائم ودائم) کا محدود عابدانہ تجربہ ہے- یہ صفت خدا کی ذاتِ اقدس میں مطلق اور ازلی طور پر موجود ہے اور وہی اس کو معبودِ برحق بناتی

ہے۔جبکہ روزہ میں اس کا ایک ظاہری اور محدود تجربہ مومن کے اس یقین میں لامحدود اضافہ کردیتا ہے کہ حقیقی ''الصمد'' صرف خدا کی ذات ہے، وہ کھانے پینے اور دیگر تمام ضرورتوں سے پاک اور اپنی تمام مخلوقات سے مکمل بے نیاز ہے۔ انسان اگرچہ عارضی طور پر اپنی بعض ضروریات اور خواہشات سے ''بے نیازی'' کا مظاہرہ کرسکتا ہے مگر اس تجربے سے اس پر صرف یہ حقیقت مزید شدت سے منکشف ہوتی ہے کہ وہ ''مخلوق'' ہے جو سراپا عجز و احتیاج ہے اور اللہ ''خالق'' ہے جو قدرتِ کاملہ اور مطلقہ کا مالک ہے۔اور مخلوق اور خالق کے درمیان صحیح رشتہ عبادت کا رشتہ ہے یعنی مخلوق عابد ہے اور خالق معبود۔

بروز منگل، ۲۰؍جون، ۲۵؍رمضان ۲۰۱۷ء

روزہ داری: ربانی اوصاف کی آئینہ داری (۲/۲)

ٹھیک اسی طرح حالتِ روزہ میں خدا کی بعض دیگر صفات جیسے الصبور الحلیم (بہت صبر و تحمل والا)، الجواد الکریم (بہت سخاوت اور نوازش کرنے والا)، العفو الغفور (بہت درگزر اور معاف کرنے والا)، الرؤوف الرحیم (بہت نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرنے والا) وغیرہ کے عابدانہ تجربے کا موقع ملتا ہے۔مثلاً روزہ دار کو لازم ہے کہ وہ ہر حال میں مکمل ضبطِ نفس (Total Self-control) سے کام لے، وہ دوسروں کی زبانی یا عملی زیادتی اور بدسلوکی پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کرتے ہوئے سراپا احسان اور خیر خواہی کی روش پر قائم رہے۔ایسی صورت حال میں وہ یہ سوچے کہ جب خدا قادرِ مطلق ہو کر اپنے سرکش اور نافرمان بندوں سے فوری انتقام نہیں لیتا بلکہ انھیں تائب ہو کر راہِ راست پر آنے کی مہلت اور ہر ممکن سہولت فراہم کرتا ہے تو پھر مجھے بھی اس کی رضا پانے کے لئے ایسا ہی کرنا چاہئے نہ کہ اپنی محدود قدرت کے بھرم میں منفی ردِعمل اور انتقام کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

اس کا بدن اگرچہ خود بھوک اور پیاس اور شب بیداری کی وجہ سے نڈھال ہے، مگر اسے دوسرے روزہ داروں کو افطار فراہم کرنے، تنگ دستوں اور ناداروں کی حاجت روائی (صدقہ، زکوۃ اور عطیات) کرنے میں ایسا فراخ دل اور نشیط ہونا چاہئے جیسے وہ، حدیث کے مطابق، لطیف ہوا کا نرم خرام جھونکا (کالریح المرسلۃ) ہو جو نہ کہیں اٹکتا نہ کسی پر بار بنتا اور بلا امتیازِ نیک و بد، ہر ایک کے اندر یکساں

طور پر ایک حیات افروز خوشگواری کا احساس جگاتا ہوا خاموشی سے آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، وغیرہ

ہر روزہ دار اپنے مخصوص احوال وظروف اور دائرۂ عمل میں اگر اپنے قول و فعل کی مسلسل شعوری نگرانی کرے، تو اسے خود بخود یہ رہنمائی ملتی جائے گی کہ کس موقع پر وہ خدا کی کس صفت کا ''عابدانہ تجربہ'' کرسکتا ہے یا اسے کرنا چاہئے تاکہ بتدریج اس کی شخصیت اور کردار ''ربانیت کے آئینہ دار'' بنتے جائیں۔ان شاء اللہ العزیز۔

یہ تقریباً وہی بات ہے جو مشہور عارفانہ مقولہ "تخلّقوا بأخلاق الله" میں کہی گئی ہے یعنی ''اللہ کے اخلاق کو اپنا اخلاق و کردار بنانے کی کوشش کرو''۔''اللہ کے اخلاق'' سے مراد یہاں خدا کی وہ صفاتِ جمال و کمال ہیں، جنہیں قرآن و حدیث میں اللہ کے بہترین نام ''أسماء اللہ الحسنی'' کہا گیا ہے۔بعض لوگ اس جملہ کو حدیث نبوی کے طور پر نقل کرتے ہیں۔مگر تحقیق سے یہ ثابت نہیں۔البتہ فی نفسہ وہ ایک نہایت بامعنی کلامِ معرفت ہے۔حتی کہ بعض علماء تزکیہ اور مشائخ تصوف اسے تمام عبادتوں اور ریاضتوں کا نصب العین اور آخری حاصل (Ultimate Outcome) قرار دیتے ہیں۔امام غزالی نے اپنی کتاب شرح أسماء اللہ الحسنی کی چوتھی فصل میں اسے کمالِ عبدیت اور حصولِ سعادت کا راستہ بتایا ہے(الفصل الرابع في بيان أن كمال العبد وسعادته في التخلّق بأخلاق الله تعالى والتحلّي بمعاني صفاته وأسمائه بقدر ما يُتصوّر في حقه)۔

قرآن کی تلاوت و سماعت اور اس میں تدبر کی ایمان پرور سرگرمیوں سے معمور، رمضان کا یک ماہی سالانہ تربیتی نظام غالباً اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ ہر فردِ مومن اپنے فکر و کردار کو ممکنہ حد تک ربانی اوصاف کا آئینہ دار بنا سکے۔

بروز بدھ، ۲۱؍جون، ۲۶؍رمضان ۲۰۱۷ء

قرآن: انسانیت کی تقدیر

(Al Quran:The Destiny of Humanity)

سورۂ القدر کی پہلی آیت اور اسی طرح سورۂ الدخان کی دوسری آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ

قرآن کا نزول ایک بہت ہی عظیم الشان اور بابرکت رات میں ہوا جو ''ہزار مہینوں سے بہتر ہے'' (سورہ القدر، آیت ۳)؛ اس رات میں ''ہر حکیمانہ امر کو طے کیا جاتا ہے'' (سورہ الدخان، آیت ۳)۔ احادیث سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس رات (لیلۃ القدر) میں خدا کے حکم سے فرشتے ہر انسان کی سابقہ سال کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کے آئندہ سال کی تقدیر کا مفصل ریکارڈ تیار کرتے ہیں۔

اس ضمن میں خصوصی طور پر یہ بتانے کا مقصد کہ قرآنِ مجید اسی رات کو نازل کیا گیا، غالباً اس حقیقت کا اعلان ہے کہ قرآن دراصل پوری کائنات اور انسانیت کی تقدیر کا نوشتہ ہے۔ دونوں کا آغاز اور آخری انجام اس میں درج ہے۔ اور جو کچھ ''لیلۃ القدر'' میں ہر سال لکھا اور طے کیا جاتا ہے وہ اسی ''نوشتۂ تقدیر'' کے رہنما اصول وضوابط کی روشنی میں ہر انسان کا بالفعل (Actual) یا بالقوۃ (Potential) ذاتی کسب (کمائی) کی سالانہ تحریری رپورٹ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کتابِ لاریب (قرآن) میں واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ابدی سعادت اور ابدی شقاوت کا معیار کیا ہے۔ خدا کا انعام یافتہ بننے کی سیدھی راہ کون سی ہے اور گمراہی کے خود ساختہ طریقے کیا ہیں جو انسان کو خدا کے غضب کا مستحق بناتے ہیں۔ لہٰذا ہر انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خود اپنی اور اس کائنات کی ''تقدیر'' کو قرآن میں پڑھ لے اور چاہے تو اسے سنجیدگی سے مان کر اس کی تحصیل میں مکمل یکسوئی کے ساتھ سرگرم ہو جائے یا اسے اپنی غفلت یا جھوٹے غرور کی بنا پر رد کر دے۔ ان دونوں طرزِ عمل کا آخری انجام کیا ہے وہ کائنات اور انسانیت کے اس ''نوشتۂ تقدیر'' میں صاف صاف لکھا ہوا ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا (لا تبدیل لکلمات اللہ)۔

میں سمجھتا ہوں سورہ الانبیاء کی آیت ۱۰ سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ ہے: "لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ" یعنی ''ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں''۔

اس بنا پر شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ لیلۃ القدر کو پانے والا وہی ہے جو قرآن کو اپنے رہنمائے حیات کی حیثیت سے پالے اور بلا بحث اس کی ہدایات کی روشنی میں اپنی ''تقدیر'' کے

بہترین ممکنات کو بالفعل واقعات بنانے میں اپنی عمر کھپا دے۔

بروز جمعرات، ۲۲/جون، ۲۷/رمضان ۲۰۱۷ء

تقدیر کیا ہے (۱/۳)

کل رات بحوالہ سورۂ القدر، سورۂ الدخان اور سورۂ الانبیاء، قرآن کے ''تقدیرِ انسانیت'' ہونے کے بارے میں جو بات لکھی تھی وہ اب تک کسی بھی قدیم وجدید تفسیر یا کتبِ علمِ کلام میں میری نظر سے نہیں گزری۔ آج سورۂ الاعلیٰ میں تدبر کرتے ہوئے مجھے اس پر مزید شرحِ صدر حاصل ہوا۔

ذاتی طور پر مجھے تقریباً پورا یقین ہے کہ قرآن، جو وحی الٰہی کا آخری مستند اور محفوظ ترین ایڈیشن ہے؛ بیک وقت انسان کے لئے ''کتابِ ہدایت'' بھی ہے اور وہی اس کی ''بالقوۃ تقدیر'' (Potential Destiny) کا نوشتہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس استنباط کے حق میں بطورِ دلیل یہی واقعہ کافی ہے کہ قرآن کا نزول ''لیلۃ القدر'' میں ہوا، جو ''ہزار مہینوں سے بہتر'' اور خدا کے ''تمام حکیمانہ فیصلوں'' کی رات ہے جن کے مطابق بالآخر کائنات کی ہر مخلوق کی ''قسمت'' یا ''تقدیر'' متعین ہوتی ہے۔ انسان چونکہ عقل اور ارادہ واختیار کی آزادی کی بنا پر دیگر مخلوقات سے ممتاز ہے، اس لئے اس کی تقدیر کے مضمرات اور ممکنات سے اس کو کتابِ الٰہی کی شکل میں آگاہ کیا گیا تاکہ وہ اپنی عقلی وارادی قوتوں کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے ان ''مقدر ممکنات'' (Predestined Possibilities) میں سے جن کا چاہے اپنے لئے انتخاب اور اکتساب (Selection & Acquisition) کرے۔ پھر اسی انتخاب اور اکتساب کے صحیح یا غلط ہونے کی بنیاد پر آخرت میں اس کی ابدی فلاح وسعادت یا ابدی خسران وشقاوت کا فیصلہ کیا جائے۔

گویا انسان اگرچہ اپنی تقدیر کے ''ممکنات'' کا ذمہ دار نہیں، مگر ان ''ممکنات'' کو بالفعل ''واقعات'' (Actual Events) میں بدلنے کی عملی اور اخلاقی ذمہ داری اس پر ضرور عائد ہوتی ہے۔

بروز جمعہ، ۲۳ رجون، ۲۸ ر رمضان ۲۰۱۷ء

تقدیر کیا ہے (۲/۳)

سورۂ الاعلیٰ کی آیات ۱-۳ سے تقدیر کے اس تصور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن میں کائنات کی ہر جاندار اور غیر جاندار مخلوق (بشمول انسان) کے چار وجودیاتی مراحل (Existential Phases) بتائے گئے ہیں: پہلا اس کو پیدا کرنا (خلق یا تخلیق)، دوسرا اس کو اپنے مقصدِ تخلیق کے لحاظ سے موزوں ترین ساخت میں ڈھالنا (تسویہ)، تیسرا اس کی ''تقدیر'' متعین کرنا اور چوتھا اس کو اس ''تقدیر'' پر چلنے کی رہنمائی دینا۔(سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ، وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ)

بالکل سادہ زبان میں ''قدر'' یا ''تقدیر'' کے معنی ہیں کسی شئے کی نشوونما، افادیت اور کارکردگی کا امکانی اندازہ اور پیمانہ مقرر کرنا۔یعنی یہ طے کرنا کہ اس چیز کا مقصدِ وجود کیا ہے، اس کے بقاء وترقی کا نظام اور دائرۂ کار کیا ہے اور وہ اپنی داخلی قوتوں اور خارجی عناصر کے باہمی تعامل سے کیا بن سکتی ہے اور کیا کرسکتی ہے۔

انسان (نیز جن) کے سوا دوسری ہر مخلوق کی جو ''تقدیر'' مقرر کردی گئی ہے وہ اس کی مجبورانہ پابند ہیں کیونکہ یہی ان کے خالق کی ''ہدایت'' ہے، انھیں اس کے سوا کسی دوسرے طریقے کا نہ علم ہے نہ اس پر چلنے کا اختیار۔مثلاً شہد کی مکھی کی ''تقدیر'' یہ ہے کہ وہ ''شہد سازی'' کا قدرتی کارخانہ چلائے۔ اس ''مقدر'' کو امکان سے واقعہ بنانے کے لئے اسے خدا نے یہ ''ہدایت'' دی کہ وہ صبح وشام باغ اور بیابان میں گشت لگائے اور وہاں طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں کا رس جمع کرے، پھر اپنے پیٹ کی رطوبتوں کے ساتھ آمیزش کرتے ہوئے ان سے مختلف ذائقوں اور رنگوں کا شیریں مشروب تیار کرے، جو شہد کہلاتا ہے اور جس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے (سورۂ النحل، آیت 68-69)۔

گویا شہد کی مکھی اور اس جیسی تمام مخلوقات کی ''بالقوۃ تقدیر'' (Potential Destiny) اور ''بالفعل تقدیر'' (Actual Destiny) دونوں ایک ہے، کیونکہ عملاً وہ دونوں خدا کے براہِ راست کنٹرول میں ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کی ''ہدایت'' ان کی ''تقدیر'' کا اٹوٹ حصہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ تمام ارضی وسماوی مخلوقات کبھی خدا کی ''ہدایت'' کے سیدھے راستے سے منحرف نہیں ہوتیں اور ان کی تقدیر کے ممکنات اور واقعات کے درمیان کبھی کوئی فرق یا تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

بروز سنیچر، ۲۴ رجون، ۲۹ ر رمضان ۲۰۱۷ء

تقدیر کیا ہے (۳/۳)

البتہ انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگرچہ بحیثیتِ مجموعی اس کا مادی وجود و بقاء اور ارتقاء بھی خالق کے مقررہ نظامِ ''تقدیر'' کا ایسے ہی پابند ہے جیسے شہد کی مکھی اور دیگر مخلوقات۔مثلاً وہ آنکھ سے دیکھے گا، کان سے سنے گا، ہاتھ پیر سے پکڑنے اور چلنے کا اور منہ سے بولنے اور کھانے پینے کا کام لے گا، وغیرہ۔

تاہم وہ آنکھ سے کیا دیکھے اور کان سے کیا سنے، زبان سے کیا بولے اور منہ سے کیا کھائے اور کیا پیئے، اپنے پیروں کو کس سمت میں یا کس راستے پر چلائے اور ہاتھوں سے کیا کام لے، وغیرہ۔اس قسم کی تمام عملی تفصیلات میں انسان کو پوری آزادی دی گئی ہے اور اس کے سامنے متعدد اور متنوع اختیارات (Diverse and Multiple Choices) رکھ دئے گئے ہیں۔جنہیں ان کے اخلاقی وروحانی نتائج کے اعتبار سے دو وسیع متقابل قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے یعنی: خیر اور شر، تقویٰ اور فجور، ایمان اور کفر، احسن تقویم کی روش اور اسفل سافلین کی روش، جنت کا راستہ اور جہنم کا راستہ، ربانی کردار اور شیطانی کردار، وغیرہ۔

دراصل یہی ''اختیارات'' انسان کی "بالقوۃ تقدیر" (Potential Destiny) اور ''بالفعل تقدیر'' (Actual Destiny) کے درمیان فرق یا تضاد پیدا کرتے ہیں جس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ اس کی ''ہدایت'' کا مسلسل انتظام کیا، تاکہ وہ اپنی ''تقدیر'' کے ان دو متقابل ممکنات سے پوری طرح آگاہ ہوجائے اور سوچ سمجھ کر اسی ''ممکن'' کو عملاً ''واقعہ'' بنانے کا انتخاب کرے جس کا آخری انجام اس کے حق میں بہتر ہو۔اسی آگہی اور انتخاب

کی صلاحیت کو قرآن (یعنی خدائی ہدایت کے آخری مستند ترین نسخے) میں دو دشوار گزار چڑھائی (النجدین) کی ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے: "وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ"۔ (سورۃ البلد، آیت ۱۰)۔

خلاصہ یہ کہ ہر انسان کی "تقدیر" دو متقابل "ممکنات" (Paradoxical Possibilities) پر مشتمل ہے جن کو قرآن نے نہایت کھلے لفظوں میں نہ صرف بیان کیا بلکہ عقلی دلائل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بھی بتا دیا کہ انسان ان "ممکنات" کے بہتر اور احسن پہلو کو کس طرح اپنی دنیا اور آخرت کو سنوارنے والے "حقیقی واقعات" میں تبدیل کرے۔ اس طرح یہ کہنا بجا ہوگا کہ قرآن ہی ہر انسان کی ممکن یا متوقع "تقدیر" کا آئینہ بھی ہے اور اس ممکن اور متوقع تقدیر کو بالفعل واقعہ بنانے کا ہدایت نامہ بھی۔ ہر سال لیلۃ القدر میں فرشتۂ وحی جبریلِ امین کے ساتھ بڑی تعداد میں فرشتوں کا نزول غالباً عالمِ بالا کو اس بات کا عینی مشاہدہ کرانے کے لئے ہوتا ہے کہ کتنے انسانوں نے قرآن میں بیان کردہ اپنی "تقدیر کے ممکنات" کو حقیقی واقعات میں بدلنے کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش کی تاکہ ان کی سعی کو خدا کی طرف سے قبولیت بخشی جائے اور کتنے ہیں جو اس کوشش کا سچا شعور اور سچا ارادہ رکھتے ہیں اور کتنے ہیں جو اس سے مطلق غافل پڑے ہوئے ہیں تاکہ اسی لحاظ سے ہر ایک کے حق میں خدائی تائید و توفیق یا اس سے محرومی کا فیصلہ کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

بروز اتوار، ۲۵ رجون، یکم شوال ۲۰۱۷ء

ہلالِ عید کا پیغام

تمام گروپ ممبران کو عید الفطر کی پُرخلوص مبارکباد۔

ہلال (نیا چاند)، خواہ وہ عید کا ہو یا غیرِ عید کا، وہ خالقِ کائنات کے ایک حکیمانہ تخلیقی قانون کی علامت اور یاددہانی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں کسی شئے کے لئے ایک حالت پر ٹھہرنا ناممکن ہے۔ یہاں عروج اور زوال،، طلوع اور غروب، بڑھنا اور گھٹنا اور ترقی اور پسماندگی کے دو متقابل مرحلوں سے گزرنا ہر شئے کا "مقدر" ہے۔ اس کائنات میں کوئی مخلوق اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ صرف خالقِ کائنات کی بلند و برتر، عظیم اور بے مثل ہستی ہے جو "لازوال" ہے، کسی بھی خارجی عامل کے زیرِ اثر اس

میں کوئی تغیر نہیں آتا، تمام "کائناتی تغیرات" اس کے علم اور حکم اور قدرت سے ہوتے ہیں مگر وہ خود ہمیشہ "غیر متغیر" رہتا ہے کیونکہ وہ "الصمد" ہے؛ یعنی ہر شئے سے بے نیاز؛ مگر ہر شئے اپنے وجود و بقاء و ارتقاء کے لئے اس کی محتاج اور نیازمند۔

ہلالِ عید کے اس علامتی پیغام کا ایک اور خاص عملی پہلو یہ ہے کہ وہ جہاں ایک "پُرمشقت" مہینے (رمضان) کے خاتمے کا اعلان ہے وہیں وہ ایک نئے مہینے (شوال) کے "پُرمسرت" آغاز کا نشان بھی ہے، جو گویا زندگی کے ایک دوسرے خدائی قانون کی یاددہانی ہے اور وہ قانون ہے: ہر دشواری کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ آسانی کا موجود ہونا؛ ہر مشقت کے پہلو بہ پہلو راحت کا راستہ ہموار ہونا۔

اس طرح ہلالِ عید بیک وقت ایک مومن کو خدا کی لازوال عظمت و کبریائی کے احساس سے سرشار کرتا ہے نیز اسی کے ساتھ زندگی کے بارے میں خدا کی حکیمانہ ہدایت کے گہرے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے اس کے ذہن کو مہمیز بھی کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ صیامِ رمضان سے متعلق آیات کے ذیل میں یہ ارشاد ہوا کہ: "۔۔۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا اور تاکہ تم روزے کی مقررہ مدت پوری کرو اور اللہ کی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کے شکر گزار بن جاؤ۔" (سورۃ البقرۃ، آیت 185) انھیں دوگونہ کیفیات کا اظہار عید کے دن تکبیر اور حمد اور صدقہ وغیرہ کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ہلالِ عید (یا کسی بھی نئے مہینے کے چاند) کی رمزی معنویت اور اس کا عملی پیغام بس یہی ہے یعنی ایک طرف اس کو دیکھ کر ایک مومن کے عقیدۂ توحید میں یقین کا تازہ اور پختہ ہونا؛ اور دوسری طرف اسے اپنے لئے "آغازِ نو" کی علامت (Symbol of A New Beginning) سمجھنا تاکہ وہ اپنے پُرمشقت حال یا تلخ ماضی کی یادوں میں دل شکستہ اور افسردہ ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ ان سے نئی بصیرت کی روشنی اور نئے عزم و ہمت کی توانائی کشید کرے اور "اللہ الصمد" پر توکل کرتے ہوئے، ایک نئے، بہتر اور روشن تر مستقبل کا آغاز کرے۔

میرا یہ استنباط، پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی اس دعاء میں طویل اور گہرے تدبر کا حاصل

ہے، جو کتبِ احادیث میں ''دعائے رؤیتِ ھلال'' کے تحت نقل کی گئی ہے۔ الترمذی کے مطابق اس کے الفاظ یہ ہیں: ''اللّٰھُمَّ أَھِلَّهُ عَلَيْنَا بِالأَمْنِ والإِيمَانِ، وَالسَّلامَةِ والإِسْلامِ، رَبِّي ورَبُّكَ اللهُ، هِلالَ رُشْدٍ وخَيْرٍ'' یعنی اے اللہ، اس نئے چاند کو ہمارے اوپر امن اور ایمان اور سلامتی اور اسلام کے ساتھ نمودار کر۔ میرا اور تیرا پروردگار اللہ ہے، اے خیر اور بھلائی کے نئے چاند!۔

تاہم یہ اسلامی تاریخ کا شاید سب سے بڑا ملی المیہ ہے کہ اس بصیرت افروز اور حیات آفرین پیغمبرانہ سنت کو سمجھنے اور اس کے سانچے میں اپنے انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی تشکیل کرنے کے بجائے، ''ھلال'' کو خود ساختہ طور پر مسلمانوں کا ''عسکری و سیاسی نشان'' (Political & military Symbol) بنا دیا گیا۔ خصوصاً عثمانی ترکوں نے اسے عیسائیوں کے قومی نشان صلیب (Cross) کے مقابلہ میں ہر سطح پر استعمال کیا، یہاں تک کہ سیاسی اور فوجی پرچم سے لے کر انسانی رفاہِ عام میں سرگرم تنظیموں کے نام اور دستاویزات میں سبز یا سرخ ہلال (Green or Red Crescent) کا نشان مسلمانوں کی ملی شناخت بن کر ابھر آیا۔ حالانکہ اس کا اسلامی شریعت یا اسلامی تہذیب وثقافت سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ محققین جانتے ہیں کہ ''ہلال'' کا نشان اسلام سے بہت پہلے قدیم یونانی، رومن، مجوسی اور مصری تہذیبوں میں ان کے مشرکانہ دیومالائی عقائد پر مبنی ایک ''مقدس علامت'' کی حیثیت سے صدیوں تک استعمال ہوتا رہا ہے۔

اس خلافِ سنت روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس ''ہلال'' کو ہر مہینہ یا کم از کم ہر سال عید الفطر کے موقع پر، مسلمانوں کے اندر ''اللہ الصمد'' پر ایمان وتوکل تازہ اور پختہ کرنے اور امن وسلامتی کی نئی امید سے مسلح ہو کر، نئے عزم اور ولولے کے ساتھ زندگی کی تعمیر وترقی کے سفر کا آغازِ نو کرنے کا محرک بننا چاہیئے، وہی ''ہلال'' ان کے نام نہاد قومی شاعر کے بقول اب پوری ملتِ اسلام کی ذلت وخواری کا تماشہ کرتا ہے۔ آج سے تقریباً سو برس پہلے عید کا چاند دیکھ کر اس شاعر نے کہا تھا۔

''خزاں میں مجھ کو رُلاتی ہے یادِ فصلِ بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں

اجاڑ ہو گئے عہدِ کہن کے مے خانے
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں
پیامِ عیش ومسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے''

یہ ''مضحکہ خیز ذلت وخواری'' دراصل نتیجہ ہے کئی صدیوں سے چھائے ہوئے اس غلط فکری اور عملی رجحان کا جس کے زیرِ اثر مسلمانوں نے ''ہلال'' کو ''خنجر'' کے روپ میں دیکھا اور اسے اپنا ''قومی نشان'' بنالیا، جو قرآن وسنت کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اگر اس عبرتناک زبوں حالی سے نجات پانی ہے تو انھیں شعوری طور پر از سرِ نو یہ دریافت (Re-discover) کرنا ہوگا کہ ''ہلال'' نہ تو ''خنجر نما'' ہے نہ ہی وہ مسلمانوں کا قومی نشان ہو سکتا ہے۔ قرآن (سورۂ یٰس، آیت 39) کے مطابق وہ شکلی طور پر کھجور کی پرانی ٹہنی کی مانند (کالعرجون القدیم) نظر آتا ہے جبکہ اپنے رمزیاتی پہلو (Symbolic Aspect) کے لحاظ سے وہ دیگر اجرامِ سماوی کی طرح خدا کی ایک نشانی ہے اور انسانوں کے لئے وقت شناسی کا ایک ذریعہ۔ نیز پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے سچے پیروکار کے لئے ہر نیا چاند ''آغازِ نو'' کا امید افزا پیغام لے کر آتا ہے تا کہ وہ اپنے گردوپیش کے منفی حالات اور ماضی وحال کے تلخ تجربات سے اوپر اٹھ کر، امن وسلامتی اور ایمان واسلام اور خیر وفلاح کی مثبت بنیادوں پر اپنی زندگی کی مسلسل تعمیرِ نو کرتا رہے۔ (أللھم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه وأرنا الأشياء كما هي۔ آمین)

ابوصالح انیس لقمان ندوی صدر شعبۂ تحقیق۔ سدرۃ فاؤنڈیشن

’’... تزکیۂ نفس کا عمل درحقیقت اپنے آپ کو اس بھرم اور خوش فہمی سے بچانا ہے کہ میں ’برگزیدہ‘ اور ’پاکیزہ‘ ہوں۔ ’’احساسِ برگزیدگی‘‘ یا اپنی پاکیزگی کا زُعم، خواہ کسی درجہ میں ہو، وہ سب سے بڑا مہلک نفسیاتی روگ ہے؛ جو انسان کی حقیقی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی ارتقاء کے تمام فطری امکانات کو کھا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، خودفریبی، خودنمائی اور خودستائی کے شیطانی جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ پھر اسے اپنا عیب بھی ہنر اور اپنے نقائص بھی کمالات دکھائی دیتے ہیں‘‘

’’.... پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کی جو بے مثال ربانی نسل تیار کی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اندر سے ’’برگزیدگی‘‘ اور ’’پاکیزگی‘‘ کے ہر احساس اور بھرم کو شعوری طور پر کھرچ کر نکال دیا تھا اور اس کی جگہ خدا کے سامنے ’’جوابدہی‘‘ کے احساس کو اپنے اندرون کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ اس لئے ان کے درمیان تزکیۂ نفس کا عمل بلا انقطاع جاری رہا۔‘‘

’’... تزکیۂ نفس کا عمل از اول تا آخر یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کا ہر لمحہ ’احساسِ جوابدہی‘ (Sense of Accountability) کے تحت خود احتسابی کرتے ہوئے گزاریں اور اپنے اندر کبھی احساسِ برگزیدگی (Sense of Chosen-ness) یا زُعم، پاکیزگی نہ پیدا ہونے دیں۔ اسی عمل نے ’’خیر القرون‘‘ کو خیر القرون بنایا اور اسی کے فقدان نے بعد کے دور کو شر القرون بنا دیا۔‘‘

’’... انسان اور مسلمان ہونے کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ آپ اپنے گرد و پیش کی دنیا کے لئے نفع بخش نہیں بن سکتے تو اس کے لئے بے ضرر بن کر رہیں (Be Useful to All Or Harmful to None)۔ اگر آپ اپنے ماحول پر کوئی ’مثبت اثر‘ نہیں ڈالتے تو اس کے منفی اثر سے خود بچیئے اور اسے اپنے منفی اثرات سے بچایئے۔ بصورتِ دیگر، سخت اندیشہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کی نظر میں شاید آپ کی گنتی نہ انسانوں میں ہو اور نہ مسلمانوں میں۔۔۔!!‘‘